زینو

(ناول)

وحید احمد

رُمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز

زینو

(ناول)

وحید احمد

نام کتاب	:	زینو (ناول) بار ششم
مصنف	:	وحید احمد
اہتمام	:	ارشد ملک
زیر نگرانی	:	سید وسیم عباس
کمپوزنگ/سرورق	:	خاوری
باراول	:	2003
بار دوم	:	2004
بار سوم	:	2005
بار چہارم	:	2007
بار پنجم	:	2021
تعداد	:	1000
مطبع	:	فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، راولپنڈی

قیمت 800 روپے

ادارہ ایسی کتب کی اشاعت کرتا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اشاعتِ کتب کا مقصد کسی کی دل آزاری یا ضرررسانی نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے، بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو از راہ کرم مطلع فرمائیں۔ ان شاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے گا۔ (ادارہ)

انتساب

منشی پریم چند کے نام

علّتِ عاشق زعلّت ہا جداست
عشق اصطرلابِ اسرارِ خداست

(رومی)

باب اول

زیتون کے درخت کے پاس آکر زینو رُکا۔ایک چھوٹا تیر ترکش سے نکالا اور کمان میں بھرا۔زیتون کے درخت میں ریشمی سرسراہٹ ہوئی،سورج موسمِ بہار کی سہ پہر میں تھا اور اُس کے پیلے تھال کو بادل کے مہین پارچے نے نقرئی کر دیا تھا۔یوں کہ اسے دیکھا جاسکتا تھا اور آنکھیں خیرہ نہیں ہوتی تھیں۔تیر کا سرا سونے کا تھا اور دُم کے گرد سونے کا پترا چڑھا ہوا تھا۔زینو نے تیر کو کمان کے ڈورے پر کستے ہوئے زیتون کی سرسراہٹ کو دوبارہ سنا۔۔۔درخت تیار تھا۔زینو نے اپنا بایاں قدم آگے اور دایاں ذرا پیچھے زمین پر جمایا اور سورج کے نقرئی تھال کا نشانہ لیا۔کمان لچک کی آخری حد تک پہنچی اور زینو کی داہنی مُٹھی لچکیلی اور نرم حرکت کرتی ہوئی دائیں کان کی لَو کے پیچھے جا رُکی۔زینو نے کھلی ہوئی دائیں آنکھ سے دیکھا کہ تیر کی نوک سورج کے مرکز میں ہے۔اُس نے سانس چھاتی میں جامد کیا اور داہنی مٹھی کو کھولا۔کمان کی تشنج بھری انگڑائی پوری توانائی کے ساتھ چھک کی آواز دیتی ہوئی تیر کے ساتھ لپٹ کر اُڑی۔چھک کی آواز نے آتے ہی سرررررر۔۔۔کی سنسناہٹ کے

ساتھ درخت نے اپنی کمان سے کوہی ابابیل کا تیر چھوڑا۔ تیر اور کوہی ابابیل فوراً نظروں سے اوجھل ہوگئے ۔اب ابابیل تیر کے دائیں طرف برابر رفتار سے اُڑ رہی تھی ۔ دونوں ایک دوسرے کے اعتبار سے ہوا میں ساکن تھے۔ ابابیل نے دیکھا کہ تیر کی سانس اُکھڑ رہی ہے۔اس کا تناؤ ٹوٹ رہا ہے اور وہ دھیرے دھیرے نیچے گر رہا ہے۔کوہی ابابیل نے اپنے پنجے تیر کی چوب میں گاڑے ۔اپنی رفتار کی رَو میں وہ اور آگے نکل گئی اور پھر ایک چکر کاٹتی ہوئی واپس اُسی راستے پر آئی جس پر وہ پہلے اُڑ رہی تھی۔ ابابیل نے ہوا کے صحرا میں پرواز کی لکیر کو پہچانا اور واپسی کا سفر کیا۔ زینو نے دیکھا کہ سورج کے تھال میں سورخ ہے جو بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ پھر یہ سوراخ بے ترتیب ہو گیا اور پھڑ پھڑانے لگا۔ ابابیل کو زینو نے دونوں ہاتھوں میں پکڑا۔ اُس کے پنجے تیر میں پیوست تھے جو زینو نے آزاد کیے ۔ابابیل دوبارہ درخت پر جا بیٹھی ۔ زینو نے تیر کو دیکھا جس پر جا بجا چھوٹے چھوٹے سوراخ بن گئے تھے۔ ''یہ تیر پرانا ہو گیا ہے''۔ یہ کہہ کر اُس نے پرانا تیر زمین پر پھینک دیا اور چلتے چلتے ایک چٹان کے قریب رُک کر بادل کے ایک ٹکڑے کو نشانہ کیا۔ اس بار تیر بڑا تھا۔ سورج نکل آیا تھا۔ جب تیر کمان سے نکلا تو سورج سونے کی اَنی پر چمکا۔ چٹان سے ایک عقاب نے نکل کر تیر کا تعاقب کیا اور زینو کے کاندھے پر آ کر بیٹھ گیا۔ تیر عقاب کے پنجوں میں نہیں بلکہ چونچ کے خم میں تھا۔

چلتے چلتے زینو سمندر کے کنارے پہنچا جو ایک اونچی چٹان کے نکلے ہوئے چھجے کے نیچے تھا۔ اُس نے اپنے باپ کی بادبانی کشتی کو ڈھونڈا مگر دُور دُور تک کچھ نہیں تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا اور اس کے اوپر ڈوبتے سُورج کا آگ بھرا گولہ ارتعاش کرتا تھا۔ جب سُورج کا پیندا سمندر کی سطح سے مس ہوا تو اس نے پنجوں پر اُچھل کر سمندر میں چھلانگ لگائی ۔اب وہ چھوٹی بڑی مچھلیوں کے ساتھ تیر رہا تھا۔ اُس نے سر پانی سے باہر نکالا اور سانس برابر کیا۔ سُورج اُس کی چھلانگ کے ساتھ ہی ڈوب گیا تھا۔

گھر پہنچ کر وہ اپنے باپ کا انتظار کرتا رہا۔ پھر اُس کی ماں نے اُسے کھانا کھلا کر سُلا دیا۔ صبح جب وہ بیدار ہوا تو اپنے باپ کے بستر کو خالی دیکھا۔ اُس کی ماں نے بتایا کہ باپ رات کو آ گیا تھا اور اب لکڑیاں کاٹنے جنگل گیا ہے۔ زینو نے صندوق سے لپٹا ہوا ایک پارچہ نکالا، اُسے کھولا اور زمین پر بچھا دیا۔ پارچے پر لکھے ہوئے مسئلہ فیثا غورث کو اس نے پڑھنا شروع کیا تو اُس کی ماں نے کھانا لا کر پارچے کے اوپر رکھ دیا۔ زینو نے کھانا شروع کیا۔

''زینو کہاں ہے۔۔۔ زینو کہاں ہے؟ اُس کے باپ کی پھولی ہوئی سانس نے رُک کر پوچھا۔ لکڑیوں کا گٹھا کمرے کے ایک کونے میں پھینکتے ہوئے اُس نے زینو کو پیار بھری سرزنش میں پوچھا:

''یہ کیا ہے۔۔۔ کیوں کیا یہ تم نے؟'' یہ کہتے ہوئے باپ کے ہاتھ میں زینو کا تیر کپکپایا جو اسے گھر آتے ہوئے رستے میں پڑا ملا تھا۔

''یہ پرانا ہو گیا ہے اس لیے میں نے پھینک دیا''۔ زینو نے جواب دیا۔

''بیٹا! سونا پرانا نہیں ہوتا۔ سونے کو یوں نہیں پھینکتے۔'' باپ نے زینو کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

باپ کے ہاتھ سے غصہ، سرزنش اور تشویش رِس رِس کر زینو کا سَر نم کر رہی تھی۔

''بابا! یہ سونا اسی تیر کے لیے تھا۔ نئے تیر کو نیا سونا لگے گا۔ سونے کی کمی کب ہے ہمارے پاس اس گھر کی بنیادوں اور صندوقوں میں اتنا سونا ہے کہ پورا یونان خریدا جا سکتا ہے۔'' زینو نے بے اعتنائی سے کہا۔

باپ نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے ہوا کو دیکھا۔ اپنی انگلی گھما گھما کر اندازہ لگایا اور زوردار آواز میں جواب دیا۔

''ابھی پورا نہیں ہاں دو تہائی یونان خریدا جا سکتا ہے۔ جب پورے یونان جتنا

سونا جمع ہو گیا تو پھر تم پرانے تیر پھینک دیا کرنا۔‘‘

زینوا پنے ماں باپ کے ساتھ بحیرۂ آ ژ کے ایک اَن دیکھے جزیرے میں رہتا تھا۔ یہ جزیرہ اس کے باپ نے ڈھونڈا تھا جو ایک مشاق جہاز ران میں تھا۔ جزیرہ ایتھنز کے شمال مشرق میں واقع تھا اور ایتھنز سے آدھے دن کی مسافت کے بعد یہاں پہنچا جا سکتا تھا بشرطیکہ سمندری ہوائیں معتدل ہوں۔ زینوا ٹھارہ سال کا تھا۔ اس کا قد دراز، بال سنہرے، ہلکے گھنگھریالے اور لمبے تھے۔ آنکھیں نیلی اور انتہائی چمکدار تھیں۔ وہ انھیں جھپکتا بھی کم تھا۔ اُس کی آنکھوں کو مسلسل نہیں دیکھا جا سکتا تھا کیونکہ دیکھنے والے کی نظر ٹھوکر کھاتی اور حدت محسوس کرتی تھی اُس کی پیشانی چمکتی تھی۔

زینو کے باپ کا تعلق مقدونیہ کے ایک دُور افتادہ قصبے سے تھا۔ وہ انتہائی ذہین شخص تھا اُس کے نین نقش واجبی تھے۔ فلسفے میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔ افلاطون کی اکیڈمی میں بیس سال تک تعلیم حاصل کی اور افلاطون کے خاص شاگردوں کی صف میں آ کھڑا ہوا۔ وہ ارسطو کا ہم عصر دوست اور مدِ مقابل تھا۔ اکیڈمی میں اکثر ارسطو سے مباحثہ رہتا اگر چہ فلسفہ، طب، حیاتیات، اخلاقیات، فنِ شعر گوئی کا عالم تھا مگر حیاتیات اس کا خاص میدان تھا۔

ارسطو انتہائی سرد مزاج تھا مگر زینو کا باپ بہت تند خو اور جذباتی تھا۔ جب ارسطو نے کہا کہ دماغ کا کام خون کو ٹھنڈا کرنا ہے تو اس نے بھر پور مخالفت کی اور بقراط کے نقطۂ نظر کی تائید کی کہ دماغ کا کام خیالات کو مجتمع کرنا ہے۔ زینو کا باپ کُوزہ گری اور ظروف کی نقش نگاری میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔ وہ ایتھنز کے ایک مصری مجسمہ ساز کے ساتھ کام کرتا تھا جو کُوزہ گری اور ظروف سازی کے باعث بہت مشہور تھا۔ مصری مجسمہ ساز کے پاس پانچ سو سال پرانے نوادرات تھے۔ جب پہلے پہل مصری اور یونانی ظروف سازی کا سنگم ہوا تو ان نوادرات میں مصریوں کے بنائے ہوئے نقشین ظروف تھے جن پر ابوالہول اور گریفن بنے ہوئے تھے۔ ان کے مدِ مقابل یونانیوں کے بنائے ہوئے قنطروس، ستور اور مائینوٹار

کے نقوش سے مزین بیش قیمت نوادرات تھے۔ زینو کی ماں اسی مصری مجسمہ ساز اور کوزہ گر کی بیٹی تھی۔ وہ زینو کے باپ کی شہرت بن چکی تھی اور اُس سے بہت متاثر تھی۔ زینو کے باپ سے عمر کے باپ میں بہت چھوٹی تھی۔ اس قدر حسین تھی کہ دیکھنے والے کی آنکھیں اس کے سراپے سے لپٹ کر سناٹے میں آجاتیں۔ ایک شرارت نے انھیں رشتہ ازدواج میں منسلک کر دیا۔

ہوا یوں کہ ایک رات زینو کا باپ مصری کوزہ گر کے کارخانے میں پہنچا۔ چراغ روشن کیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک نیا مجسمہ موجود ہے جو نسوانیت کا شاہکار ہے اور سنگ تراشی کے باقی اعلیٰ ترین نمونوں کے عین وسط میں ہے، اس کے ایک طرف ''ایفروڈائٹ'' اور دوسری طرف ''ہیرا'' کا مجسمہ ہے۔ دیکھنے والا دم بخود رہ گیا اور دھیرے دھیرے مجسمے کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ پتھر نگاہوں کے ساتھ مجسمے کو دیکھ ہی رہا تھا کہ مجسمے نے ہاتھ بڑھا کر اس کے رخساروں کو چھوا اور اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں میں پیوست کر دیے۔ اسی دوران مصری مجسمہ ساز کمرے میں داخل ہوا تو مجسمہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ مصری مجسمہ ساز نے دونوں کی شادی کر دی۔ زینو کا باپ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی مکار بھی تھا۔ اُس نے مصری مجسمہ ساز کی بیٹی تو خیر حاصل کر لی۔ منت سماجت کر کے پانچ سو سال پرانے نوادرات میں سے بھی بہت کچھ لے لیا۔ زینو کے نقوش اپنی ماں سے ملتے جلتے تھے۔

بے انتہا علم اور تحقیق کے بعد زینو کا باپ بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ علم طاقت ہے اور دولت بھی طاقت ہے۔ چنانچہ منطق کی رُو سے علم دولت ہے۔ اُس نے یونان کا امیر ترین انسان بننے کا خواب دیکھا اور تعمیر کے لیے سرگرداں ہوا۔ مقدونیہ میں وہ ایک متوسط درجے کا شہری تھا۔ تاریخ اور سیاست کا گہرا شعور رکھنے کی وجہ سے اُسے یہ احساس ہوا کہ یونان اپنی خانہ جنگیوں کے باعث رہائش کے قابل نہیں رہا۔

یہ وہ دور تھا جب مقدونیہ کا بادشاہ فلپ دوم گھوڑوں کے سموں سے سارا یونان

ناپ رہاتھا۔ایتھنز علم ودانش کا گہوارہ اور یونان کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر تھا۔مقدونیہ کو سارا یونان بربری، وحشی اور غیر مہذب سمجھتا تھا۔کیونکہ وہ شکاریوں، شرابیوں ،لٹیروں اورکسانوں کی سرزمین تھی اورشہری ریاستوں کے نظام میں پاتال تک گری ہوئی تھی ۔اُس کی زبان بھی کرخت تھی ۔یونان زبان میں بدیسی لفظوں اور لہجے کی آمیزش اہلِ یونان کوگراں گزرتی تھی ۔خاندانی بادشاہت چل رہی تھی ۔

پیلو پونیز جنگ میں بھی مقدونیہ کا کردار مشکوک تھا۔فلپ دوم اگرچہ نہایت ذہین تھامگر بےضمیر، بدکرداراور مطلق العنان بھی تھا۔اُس کے ذہن میں بس ایک ہی سودا سمایا تھا اور وہ تھا تمام یونان پر مقدونیہ کی حکمرانی اور بے انتہا دولت کا حصول ۔اُس کی بیوی اولمپیاس شہزادی تھی ۔جب سکندر پیدا ہوا تو بادشاہ کوولی عہد ملا اوراس کے عزائم کوتقویت پہنچی ۔فلپ دوم شراب نوشی اورزنا کاری کا بھی بادشاہ تھا۔مقدونیہ آبادی کے اعتبار سے یونان کی سب سے زیادہ گنجان آباد ریاست تھی ۔جب بادشاہ نے یونانی ریاستوں پرلشکرکشی کی تو اُن تمام آبادیوں کوتاراج کرتا گیا جہاں ذرا بھر بھی مزاحمت نظر آئی ۔پھراس نے کوہ پینجیئم کوفتح کیا جہاں سونے کی کانیں سالانہ ایک ہزار ٹیلنٹ پیدا کرتی تھیں اُس نے اپنی عیاری سے سونا پیدا کرنے والے ریاستی کارندوں کو اپنے جال میں پھانسا اوراُن کاضمیر خریدا۔ان بیش قیمت لوگوں کواُس نے انعام کےطور پراپنا نام عطا کیا اوروہ لوگ بھی فلپ کے نام سے پکارے جانے لگے ۔جب قریب قریب سارایونان مقدونیہ کے بادشاہ کے زیر نگیں ہوا اورگھوڑوں کی ٹاپیں ایتھنز کے گلی کوچوں میں سنائی دینے لگیں تو زینو کے باپ نے خطرے کو بھانپا۔اُس کے علم ودانش کے چرچے اوراُس کی بیوی کےحسن کی اساطیری داستانیں بادشاہ کےمحل تک پہنچ چکی تھیں ۔زینوسولہ برس کا تھا وہ ماں باپ کےساتھ اپنے نانا کے گھر مقیم تھا۔رات گئے بادشاہ کے کچھ کارندے گھر میں داخل ہوئے اورزینوکی ماں کا مطالبہ کیا۔مصری مجسمہ ساز نے مزاحمت کی تو انھوں نے گھر کی تلاشی لی ۔جب کارندے

مجسموں کے کارخانے میں پہنچے اور چراغ جلا کر ڈھونڈنا شروع کیا تو ناکام ہوئے۔ ہر طرف مجسمے تھے جن میں ''ایفروڈائٹ'' اور ''ہیرا'' کے درمیان ایک دیوی کا مجسمہ تھا۔

ایتھنز سے کچھ فاصلے پر سمندر تھا۔ اگلے دن زینو کے باپ نے اپنی بیوی اور زینو کو ساتھ لیا اور بڑی بادبانی کشتی میں بٹھایا۔ ایتھنز کے شمال مشرق میں ایک جزیرہ تھا جسے یونانی آسیب زدہ کہتے تھے۔ مشہور تھا کہ جو بھی اس جزیرے کا رخ کرتا ہے اُس کی کشتی ڈوب جاتی ہے کیونکہ جزیرے کے گرد زمین کی کھینچ میں شدت ہے اور پانی سمندر کی باقی سطح سے نیچا ہے۔ زینو کے باپ نے قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ جزیرے کے قریب گرداب اپنا جال بچھائے ہوئے تھے۔ کشتی گھومتی اور جھومتی بالآخر جزیرے پر آ لگی۔ زادِ سفر کھانے کا سامان تھا۔ پسا ہوا آٹا، زیتون کا تیل، پھل اور شراب۔ یہ سامان ایک ہفتے کے لیے کافی تھا۔ چند اوزار تھے۔ جن میں کلہاڑے، نیزے، آرے اور چھینیاں وغیرہ تھیں۔ ایک صندوق میں کچھ کپڑے تھے۔ لپٹے ہوئے بہت سے پارچے اور کھالیں تھیں، جن پر مختلف علوم کے اہم نکات درج تھے۔

جب یہ تینوں جزیرے پر اُترے تو زینو کا باپ وہاں کی زرخیزی اور قدرتی دولت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ انواع و اقسام کے درخت تھے یونان میں شاہ بلوط، زیتون، جونیپر، صنوبر اور پاپلر کے درخت نظر آتے تھے مگر یہاں ان درختوں کے علاوہ ناریل کے درختوں کا جنگل تھا اور کچھ ایسے درخت بھی تھے جو ان لوگوں نے پہلے نہیں دیکھے تھے۔ پرندوں کی بہت سی قسمیں تھیں۔ پھل دار درختوں کی بہتات تھی جزیرہ زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اس میں صاف پانی کی ایک بہت بڑی جھیل تھی۔ میدان اور ٹیلے تھے۔ بعض ٹیلے چھوٹی پہاڑیوں کے برابر تھے۔

زینو کا باپ آرام کرنے کے بعد شاہ بلوط کا ایک درخت کاٹنے لگا تاکہ گھر بنایا جائے تو زینو نے اسے روکا اور کہا کہ اس درخت کی بجائے وہ کوئی اور درخت کاٹے۔

’’کون سا درخت؟‘‘ باپ نے پوچھا۔

’’وہ۔‘‘ زینو نے دُور ایک درخت کی طرف اشارہ کیا۔’’ کیوں؟‘‘

’’یہ درخت کہتا ہے مجھے مت کاٹو، جبکہ وہ درخت کہتا ہے مجھے کاٹو۔‘‘ باپ زینو کی بات مانتا تھا کیونکہ اس میں انہونی صلاحتیں تھیں۔ باپ اگرچہ توہم پرست نہیں تھا مگر وہ اس کی بات کو انکار کرنے کی جراُت بھی نہیں رکھتا تھا۔

ہفتے عشرے میں پتھر کی دیواروں کا گھر بنایا گیا جس کے دو کمرے تھے۔ چھت لکڑی کی تھی۔ بڑے کمرے میں ماں باپ رہتے تھے۔ زینو کا کمرہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ جب باپ نے ایک مضبوط کواڑ بنانے کا منصوبہ بنایا تو زینو نے مخالفت کی۔ جب باپ نے جنگلی جانوروں اور حشرات الارض سے حفاظت کی دلیل دی تو زینو نے کہا کہ اگر کسی نے آنا ہوا تو پہلے میرے کمرے میں آئے گا اور میرے کمرے میں کوئی نہیں آئے گا۔ چارو ناچار باپ کو فیصلہ بدلنا پڑا مگر ایک خوف اس کے دل میں ہر وقت موجود رہا۔

پانی کے لیے جب وہ کنواں کھود رہے تھے تو اس وقت باپ کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب سونے کا ایک ڈلا نکلا۔ کنواں کھودتے کھودتے چند اور ڈلے انھیں ملے۔

’’کاش میرے پاس لوگوں کی ایک فوج ہوتی اور میں جگہ جگہ کھدائی کرواتا اور سونا ذخیرہ کرتا۔۔۔!‘‘

اُس نے حسرت سے کہا۔

ایک دن زینو اپنے باپ کے ساتھ دشت نوردی کر رہا تھا کہ ایک سانپ راستے میں پھن اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ باپ کی سٹی گم ہو گئی۔ زینو نے کچھ آوازیں نکالیں اور جسم کو عجیب طریقے سے جُنبش دی اور سانپ کے قریب جا کر بیٹھ گیا پھر اس نے چھوٹی کدال سے زمین کھودنا شروع کی۔ باپ یہ منظر دُور سے دیکھ رہا تھا۔ جب زینو باپ کی طرف چلا تو سانپ بل میں چلا گیا۔ زینو باپ کے پاس آ کر رُکا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے باندھے ہوئے تھے

پھر اس نے دونوں مٹّھیاں باپ کے چہرے کے قریب کھولیں۔ باپ کا منہ حیرت سے کھل گیا جب اُس نے سونے کی دو ڈلیاں زینو کے ہاتھوں میں دیکھیں۔ اُس نے زینو کے ہاتھوں کو چوما اور کہا:

''اگر کچھ اور کھودو ممکن ہے کہ۔۔۔''

''واپس گھر چلیں۔'' زینو نے کہا۔

''مگر۔۔۔؟''

''مگر اور کھدائی نہیں ہوگی کیونکہ باقی ڈلیاں سانپ کے بل میں ہیں''۔

''اگر تم کھودو تو سانپ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔''

''ہاں! نہیں کہے گا مگر میں نہیں کھودوں گا۔''

باپ نے دل پر پتھر رکھ کر واپسی کے لیے قدم اٹھائے۔ جب چلتے چلتے زینو نے بتایا کہ زمین میں بہت سونا ہے تو باپ کی باچھیں کھل گئیں۔

مگر اُس وقت اُس کی امیدوں پر پانی پھر گیا جب زینو نے کہا۔

''مگر سارے کا سارا قابلِ حصول نہیں کیونکہ دستیابی بہتر نہیں۔''

''کتنی مقدار دستیاب ہے؟''

''بہت ہے۔''

''پھر بھی کتنی؟۔۔۔کتنی!'' باپ نے لجاحت سے کہا۔

''ہزاروں ٹیلنٹ کے برابر۔'' زینو نے جواب دیا۔

زینو کا باپ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ ایتھنز میں ایک سونے کے ڈلے کے بدلے شہر کی ساری نعمتیں اُس پر کھل سکتی تھیں مگر جب یہ راز افشا ہوا تو اس کا نتیجہ کتنا بھیانک ہوگا اور وہ بھی فلپ کے دورِ حکومت میں۔ یہ سوچ کر باپ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پھر اس نے منصوبہ بنایا اور اگلے دن کشتی میں چند ڈلے سونے کے لے کر ایتھنز روانہ ہوا۔

وہ ایک بہت بڑا عالم ہونے کے باعث ایتھنز میں مشہور تھا۔ جب وہ شہر میں پہنچا تو مختلف جگہوں پر اُس نے مشہور کیا کہ دیوتا زیوس نے خواب میں اسے ہدایت کی ہے کہ وہ جزیرے پر اُس کا ٹمپل بنائے تا کہ اس جگہ آسیب ٹوٹ سکے۔ یہ آسیب آئندہ بیس سالوں میں ٹوٹے گا۔ اس دوران جزیرے کے اردگرد کا پانی جو کششِ ثقل کے خاص تناؤ کی وجہ سے نیچا ہے، صرف اور صرف اسے جزیرے کی رسائی دے گا۔ اگر کسی اور شخص نے وہاں پہنچنے کی جرأت کی تو غرق ہو جائے گا اور آفت یونان پر طاعون اور قحط کی صورت میں اپنا قہر توڑے گی۔ یونان کے لوگ چونکہ وہمی اور دقیانوس تھے۔ یہ سن کر سناٹے میں آ گئے اور اس کے چیندہ ہونے پر رشک کرنے لگے۔ ایک سونے کے ڈلے کے عوض اُس نے بہت سا اناج، قیمتی پارچات اور گھر کی دیگر ضروریات خریدیں اور واپسی کا سفر کیا۔ دورانِ سفر اُسے یاد آیا کہ وہ اپنے سسر سے مل کر نہیں آیا مگر وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ اُس نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔

اب زینو کا باپ ایک ماہ میں دو بار شہر جاتا۔ باقی دنوں کا معمول یوں تھا کہ ہر روز طلوعِ آفتاب سے نصف النہار تک وہ زینو کو تعلیم دیتا۔ اپنی تمام دنیا داری کے باوجود اپنے علم کا خزانہ اپنے بیٹے میں منتقل کرنا چاہتا تھا اور بدلے میں ہر دوسرے تیسرے دن زینو اسے سونا لا کر دیتا۔ زینو کا حافظہ لاجواب تھا۔ اسے اپنے باپ کا پڑھایا ہوا ہر لفظ زبانی یاد تھا۔ وہ اس شدت سے تعلیم حاصل کرتا کہ اس کا باپ نڈھال ہو جاتا تھا مگر تعلیم دینا اُس کی خواہش بھی تھی اور مجبوری بھی۔ ایک دن باپ نے ذرا بے اعتنائی سے تاریخ پر بحث کی۔ اگلے دن زینو نے بے دھیانی سے کھدائی کی اور سونے کی ریت لا کر دی جس میں بہت سی معدنیات کے ذرے تھے۔ باپ سونے کے ذرے نکال کر انھیں باہم جوڑنے کا فن جانتا تھا۔ مگر اس محنت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ سونا زمین میں ڈلیوں کی صورت میں موجود تھا۔

زینو بمشکل سات سال کا تھا جب اُس نے اپنے باپ سے تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ اُس کا باپ یونان میں ہر جگہ پھرتا اور اپنا کنبہ ساتھ رکھتا تھا۔ چار سال کے بعد کے تمام حالات زینو کے ذہن پر نقش تھے۔ جب زینو بچہ تھا تو اُس کا باپ تعلیم اُس کے ذہن کے تناسب سے دیتا تھا۔ جُوں جُوں وہ بڑا ہوتا گیا تو تعلیم بھی ترقی کرتی گئی۔ باپ اپنے علم کا ریلا بہت حد تک زینو کے ذہن کی جھیل میں منتقل کر چکا تھا۔ زینو کو یاد تھا کہ ایک بار سایون میں بحرِ تھریسیہ کے کنارے پر اُس کے باپ نے علت و معلول کے موضوع پر چار دن بھاشن دیا تھا۔ تھیسلی میں پائن کے درخت کے نیچے حیاتیاتی مادے کے ارتقاء کی بات ہوئی تھی۔ لیوکاس کے جزیرے پر بحرِ آیونیہ کا ساحل خنک تھا اور وہاں حرارت کے اثرات زیرِ غور تھے۔ ریاست ایلس کے شہر اولمپیا میں علم الاخلاق زیر بحث تھا۔ سپارٹا میں پیلو پونیز جنگوں کے اسرار و رموز اُجاگر ہوئے تھے۔

تھیبس میں جب یونانی تہذیب کا باقی دُنیا سے موازنہ کیا گیا تو ایک سیاہ خار پشت سامنے سے گزرا۔ ایتھنز میں زینو نے افلاطون کی اکیڈمی دیکھی جہاں اب افلاطون کا بھتیجا سپوسپس منتظمِ اعلیٰ تھا۔ وہاں اکیڈمی کے طلبہ کے ساتھ زینو نے منطق پر بحث کی زینو کا باپ اپنے بیٹے کے بے پناہ حافظے اور منطق کی کاٹ پر فخر کرتا تھا جو اب رشک میں بدلتا جا رہا تھا۔ اُن کا معمول تھا کہ جزیروں میں پہروں چلتے ہوئے علم کا اعادہ کیا جائے۔ زینو کو اس وقت اُکتاہٹ ہوتی جب اس کا باپ اچانک موضوع تبدیل کر کے اپنی گفتگو سونے کی تلاش پر مرکوز کر دیتا۔

''ہاں تو یہ بتاؤ بیٹا! کہ سونے کے ڈلوں کی کان کہاں مل سکتی ہے۔ جہاں صرف پیلی چکا چوند ہو۔''

''سونے کے ڈلے عموماً زمین ہی پر مل جاتے ہیں یا اتھلی گہرائی پر، گہرائی میں سونے کے ذرے ہوتے ہیں، جو دوسری معدنیات میں اتنے مل چکے ہوتے ہیں کہ مٹی اور

پتھر کے رنگ سے اندازہ کرنا مشکل نہیں رہ جاتا۔''

''تو بات ہو رہی تھی کہ فلسفہ سچ کی تلاش ہے۔''

''مگر بیٹا! سونے کی تلاش کو آسان بنانے کی کوئی تدبیر کرو۔''

''بابا! اب تو ہمارے برتن بھی سونے کے ہیں۔تم سونے کے جام میں شراب پیتے ہو۔چالیس صندوق سونے سے بھرے ہوئے ہیں۔کمرے میں جگہ نہیں رہی۔اب تم زمین کھود کھود کر سونا دباتے ہو اور کھدائی بنیادوں تک پہنچ گئی ہے۔اس قدر سونے کا استعمال کیا ہے فائدہ کیا ہے؟ تمہارے جوتے کے چرم اور فرغل کے سوت پر سونے کے پترے ہیں۔جب تم دھوپ میں چلتے ہو تو دمکتے ہو۔چاندنی میں گھومتے ہو تو جھلملاتے ہو۔اب بس کرو ماں کا خیال کرو میرا خیال کرو''۔

''تم دونوں کا ہی خیال رکھا ہے۔'' باپ نے غصے میں کہا۔

اب زینو نے اپنے طیش کے گھوڑے کو ایڑ دی۔کبھی کبھی زینو کے تیور بگڑتے تو وہ سچ کو ہیبت ناک حد تک عریاں کر دیتا۔

''بابا! تم نے علم کو ایک کھیل سمجھ کر حاصل کیا ہے اور بہت حاصل کیا ہے۔تم یونان کے گنے چنے دانشوروں میں سے ہو مگر تمہاری ذات تمہاری آگہی سے مختلف ہے۔دولت کے حصول کے لیے تم نے مجھے اور میری ماں کو گروی رکھا ہوا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' باپ نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

''تمہیں معلوم ہے۔'' زینو نے تقریباً چیخ کر کہا۔

''کیا معلوم ہے۔'' باپ نے ماتھے کی زمین پر حیرت کا ہل چلایا تو لکیریں نکلیں۔

''تمہیں۔۔۔معلوم۔۔۔ہے۔'' زینو نے ہر لفظ پر زور دے کر کہا۔

باپ نے علم بیان اور فنِ خطابت کی پٹاری سے لفظوں کا سانپ نکالا۔

''تم کہتے ہو تمہیں گروی رکھا ہوا ہے میں نے ! حرص کے قلعے میں قید کر رکھا ہے سونے کا قفل لگا کر! کیا میرے اندر جو علم و آ گہی کا سمندر تھا اُسے ہزار سورجوں کی دھوپ نے چھنا کے سے اڑ کر صحرا کیا ہے؟ کیا تمہاری سوچ کے دشت کو کسی حادثے نے علم کا بحیرۂ آ ژا اور آ گہی کا بحیرۂ روم بنایا ہے۔کیا مجھے تمہاری عمر اور اُس کے تقاضوں کا علم نہیں۔گزشتہ ڈیڑھ سال سے، مہینے میں دوبارہ جب بھی میں ایتھنز جاتا ہوں تو کیا تم میرے ساتھ سفر نہیں کرتے۔اس جزیرے کے اردگرد جو کششِ ثقل کا تناؤ ہے۔کیا اسے صرف بادبانوں کے پارچے رام کرتے ہیں یا اُس میں میرے ناخنِ تدبیر کا بھی کوئی ہاتھ ہے؟ جب تم ایتھنز جاتے ہو تو فقط بحیرۂ آ ژ کی لہریں گنتے ہو اور میں بادبان کی رسیوں کی بیمار گرہوں پر اپنی ہتھیلیوں کی مرہم لگا کر کشتی کی تیمارداری کرتا ہوں۔جزیرے کی زرخیزی میں تم سونے کے تیروں سے چاند اور سورج کو نشانہ کرتے ہو تو میں پتھر سے سونا کشید کرتا ہوں۔یہ ساری دولت کس کے لیے ہے۔کیا تمہارے اور تمہاری ماں کے علاوہ بھی کوئی ہے اس جزیرے پر۔۔۔؟ کیا کوئی ہے۔۔۔؟''

زینو نے باپ کو ٹھہری ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔

''بولو! پتھر کیوں ہو گئے؟'' باپ چنگھاڑا۔

''میں شکوہِ الفاظ سے متاثر نہیں ہوتا کیونکہ میں علمِ بیان اور خطابت کو کمینگی کی آخری حد سمجھتا ہوں۔ مجھے افلاطون کا مکالمہ گارگیاس زبانی یاد ہے جو تم نے مجھے پڑھایا تھا اور تمہیں یاد نہیں۔اُس مکالمے میں جو سقراط کا نقطۂ نظر ہے، مجھے اس سے اتفاق ہے۔مگر چونکہ تم لفظوں کے پتھر چن کر سٹیڈیم بناتے ہو اور اس میں لہجے کا تماشا کرتے ہو، اس لیے تمہیں تمہارے لہجے میں سمجھانا پڑے گا۔'' زینو نے نیلی جھیل کے خنک پانی کی طرح ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تو سمجھاؤ۔'' باپ کی سُرخ آنکھوں میں غیظ نے کوندا مارا۔

''کبھی ماں کو پہلی رات کے بعد غور سے دیکھا ہے۔کتنی مختلف ہے تمہاری جمالیات کی جھیل جس میں تم نے دنیا داری کا کھار ملایا تو اس کے پانی کا نیل اُڑ گیا۔کیا تمہاری بینائی کو سونے کے عقاب نے چونچیں مار مار کر اتنا کور کر دیا ہے کہ تمہیں مجسم جمال تک نظر نہیں آتا۔سونے کے ذرے گزشتہ ڈیڑھ دہائی سے تمہارے خون میں سرایت کر گئے ہیں اور غالب گمان ہے کہ تم بانجھ ہو چکے ہو۔تمہاری رطوبتیں خشک ہو گئی ہیں۔دُنیا کی نظروں میں تم ہر فن میں یکتا ہو مگر میری نظر میں تم صرف اور صرف ایک مجسمہ ساز ہو۔ایک لمحہ تھا کہ میری ماں کے ایک طرف ''ایفروڈائٹ'' کا مجسمہ تھا اور دوسری طرف ''ہیرا'' کا مگر اب ان دونوں کے درمیان ایک مجسمہ ہے جو تمہاری بیوی کا ہے جسے تم نے سالہا سال سے چھوا نہیں اس خوف سے کہ کہیں دولت جمع کرنے کے جنون میں خلل نہ پڑے۔یونان میں تم دولت کا خام مال علم کی صورت جمع کرتے تھے اور جزیرے میں ریت سے سونا نکالتے نکالتے تمہارے ہاتھوں کی پوریں زرد اور وریدیں سیاہ ہو گئیں ہیں۔تم تین تین دن نہیں سوتے اور پھر نڈھال ہو کر اپنے ادھ پیے جام کے اوپر منہ کے بل گر جاتے ہو۔کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب تم غشی کی نیند سوتے ہو تو حشرات الارض تم پر رینگتے ہیں اور تمہارے سر سے وحشت آلود خواب چُن چُن کر کھاتے ہیں۔کیا تمہیں علم ہے کہ جو حشرات تمہیں چُھوتے ہیں جنگل اُن سے یوں نفرت کرتا ہے جیسے یونانی باقی دنیا کی بربری قوموں سے۔کیا تم جانتے ہو کہ تمہاری بیوی کی آنکھیں کیسی ہیں؟ اُن کی کنجوں میں دراڑیں پڑ گئی ہیں، جن میں آنسو سہولت سے بہتے ہیں۔اپنی بیوی کو اُس کے باپ کے پاس چھوڑ آؤ تاکہ مجسمہ سازی کے کارخانے میں ایک بت کا اضافہ ہو سکے!'' یہ کہہ کر زینو نے نصف النہار پر اُبلتے ہوئے پورے سُورج کا نشانہ باندھا تو تیر پر کوہی ابابیل لپکی۔

باپ نے کنجِ لب سے اُبلتے ہوئے کف پر آستین رکھی تو فرغل کا سونا جھلملا یا۔

''اور جہاں تک میرا تعلق ہے میرا مسئلہ وحشت کا ہے۔مجھے مزید سونا ڈھونڈتے

ہوئے وحشت ہوتی ہے۔ فلپ کے پاس اتنا سونا نہیں ہوگا جتنا تمہارے ذخیرے میں ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ سونے کے ذخیرے کی ایک خاص بوُ ہوتی ہے۔ کیا تمہیں اس کا احساس ہوتا ہے؟ مگر تمہیں یہ احساس کیوں ہوگا کہ تمہاری سانسوں میں بھی سونے کی بو ہے۔''

باپ نے خلافِ توقع قہقہہ لگایا جو اتنا زوردار تھا کہ زینو کا پرواز کے لیے تولا ہوا تیر ڈھیلا پڑ گیا اور درخت سے پرندوں کی ڈار بے ترتیبی سے اُڑی۔

''بہت خوب۔۔۔ بیٹا بہت خوب۔ تم فنِ خطابت جان گئے ہو۔ یعنی لفظوں کا صحیح چناؤ، لہجے کے آہنگ کا زیر و بم اور دلیل کی کاٹ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر باپ بھی مدِ مقابل ہو تو مقابلہ دشمن بن کر کیا جائے۔ داخلی سوچ کو اس طرح لوچ دی جائے کہ اس پر خارجی ہونے کا گمان ہو اور عین صحیح ہونے کا شائبہ۔'' باپ نے اپنے لہجے کو مسلسل سرد کرتے ہوئے کہا اور زینو کے ماتھے کو چوما۔ زینو نے باپ کے ہونٹوں سے عیاری اپنے ماتھے میں سرایت کرتی ہوئی محسوس کی۔

''یہ فنِ خطابت سوفسطائیوں کا ہتھیار ہے میں سوفسطائی نہیں ہوں میں نے یہ انداز اس لیے اختیار کیا کیونکہ تم سوفسطائی ہو اور جیسا کہ ارستوفینیز نے اپنی پیروڈی ''بادل'' میں کہا ہے کہ سوفسطائی جھوٹ کو یوں پیش کرتے ہیں جیسے سچ اور سچ کو یوں دکھاتے ہیں جیسے جھوٹ ہو مگر ہم ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں لفظوں کی شعبدہ گری زیب نہیں دیتی۔ ہاں ذخیرہ الفاظ کا پتہ ضرور دیتی ہے۔'' زینو نے کہا۔

''تم شریر اور حیرت ناک ہوتے جا رہے ہو۔'' باپ نے زینو کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا اور زینو کے تیور ہموار کرنے کا عمل جاری رکھا۔

''جب تم چھوٹے سے بچے تھے تو میں نے ایروس کا ایک بہت خوبصورت مجسمہ تمہیں کھیلنے کے لیے لا کر دیا، جو گڑیا کے برابر تھا۔ ایک دن تم نے مجسمہ زور سے دیوار پر مارا تو اس کا عضوِ تناسل ٹوٹ گیا۔ تمہاری ماں نے مجسمہ اٹھایا اور مجھے طنز سے دیکھتے ہوئے کہا

کہ پہلے ایروس دیوتا تھا اب تم جیسا انسان ہو گیا ہے۔۔۔ہاہاہاہاہا۔۔۔

تمہاری ماں کی حسِ مزاح اتنی پتھریلی ہے کہ سننے والے کو سنگسار کر دیتی ہے۔دراصل علم اُس کے قریب سے بھی نہیں گزرا۔اُس کی سوچ اتنی بانجھ ہے کہ دشت کا گماں ہوتا ہے وہ اتنی کم عقل ہے کہ۔۔۔''

''کوئی بھی کم عقل نہیں ہوتا۔۔۔کوئی بھی!!!''

زینو نے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کو پھن کی طرح باپ کی آنکھوں کے سامنے اس قدر زور سے اکڑایا کہ پور ٹیڑھی ہو کر باہر نکل آئی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد باپ نے دیکھا کہ زینو کے تیور ابھی تک بگڑے ہوئے تھے۔جب زینو اپنے بستر پر لیٹا تو باپ نے زینو کو راضی کرنے کے لیے ہومر کی ایلیڈ گا کر سنانا شروع کی۔گانے سے پہلے اُس نے بہت اونچے جوتے پہنے۔لہراتا ہوا فرغل زیب تن کیا۔ چہرے پر ماسک سجایا اور وہ روپ دھارا جو ایتھنز کے اداکار تھیٹر میں اختیار کرتے تھے تاکہ دُور دُور تک نظر آسکیں۔باپ کی آواز اگرچہ سُر میں تھی مگر اس قدر بھیانک اور پھٹی ہوئی کہ زینو نے چلاّ کر کہا'' گانا بند کرو اور آئندہ کبھی گانے کی کوشش نہ کرنا۔''

جزیرے پر رہتے ہوئے اب دو برس گزر چکے تھے۔موسم سرما کی چمکیلی دوپہر تھی۔چٹان کے چھجے پر کھڑے ہو کر زینو نے تیر سمندر میں داغا۔کوہی ابابیل نے تعاقب کیا۔اب ابابیل اور تیر ہوا میں ایک دوسرے کے اعتبار سے ساکن تھے۔ابابیل نے اپنے پنجے تیر کی چوب میں پیوست کیے۔کوہی ابابیل کے پاؤں عموماً کمزور ہوا کرتے ہیں۔ہوا بہت تیز تھی ابابیل نے بہت دیر تک جھونکوں سے جنگ کی اور اس کشمکش میں سمندر میں دور نکل گئی۔اب اُس کی سانس اکھڑ رہی تھی کچھ دیر بعد وہ پھڑ پھڑاتی ہوئی پانی کی سطح پر گری۔

بادبانی کشتی میں پانچ سپاہی تھے جو دارا کی فوج کی طرف سے یونان کے گردو پیش پر نگراں تھے۔انھوں نے پانی پر پھڑ پھڑاہٹ سنی تو ایک سپاہی نے چھلانگ لگائی۔جب

وہ واپس کشتی میں آیا تو اُس کے ہاتھ میں کوہی ابابیل تھی جس کے پنجے تیر میں گڑے ہوئے تھے۔ پانچوں کی نظریں بھی ابابیل کے پنجوں کے ساتھ تیر میں گڑ گئیں۔ ایک نے ابابیل کو الگ کر کے سمندر میں پھینکا تو اُس کے پر پانی کی سطح پر پھیل گئے۔ جزیرہ پندرہ سٹیڈیم کے فاصلے پر تھا۔ انھوں نے کشتی کا رُخ جزیرے کی طرف کیا تو ایک سپاہی نے شدید مخالفت کی۔ اُسے علم تھا کہ جزیرہ آسیب زدہ ہے مگر جب آسیب اور تیر پر لگے ہوئے سونے کا موازنہ کیا گیا تو سونا بھاری نکلا۔ جوں جوں جزیرہ قریب آتا جا رہا تھا پانی کی سطح گرتی جا رہی تھی اور کشتی پانی کے اندر دھنس رہی تھی۔ حتیٰ کہ پانی کشتی کے کناروں کو چھونے لگا پانی میں جگہ جگہ گرداب تھے اور اُن کے گھماؤ میں اتنی شدت تھی کہ پانی میں جا بجا سیاہ روزن بنے ہوئے تھے۔ انتہائی جدوجہد کے بعد جب کشتی کنارے لگی تو پانچوں اپنے بھالے، خنجر، تلواریں اور تیر کمان اٹھا کر باہر نکلے۔ سروں پر خودیں جمائیں جن کی پتلی زنجیریں پشت پر آہنی آبشاروں کی طرح گرتی تھیں۔ دور شاہ بلوط کے درختوں میں ایک پہاڑی نما ٹیلہ تھا جس پر زیوس کا مجسمہ ایستادہ تھا۔ پانچوں نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ نرم گھاس کے بیچ میں ایک پگڈنڈی تھی جو انھوں نے اختیار کی۔ راستے میں انھیں ایک اور تیر ملا جس کا پھل سونے کا تھا اور اُس کی دم کے گرد سونے کا پترا لپٹا ہوا تھا۔ اُس کی چوب میں سوراخ تھے۔ ایک سپاہی نے وہ تیر اٹھا کر اپنے ترکش میں رکھا۔ جھیل کے اُس پار انھیں ایک گھر نظر آیا جو سہ پہر میں سرمئی جھلک دیتا تھا گھر اگرچہ درختوں نے چھپا رکھا تھا مگر دھوپ اُسے عریاں کرتی تھی۔

''زینو ابھی تک نہیں آیا۔'' یہ سوچ کر باپ دروازے کے قریب آ کر رُکا۔ اگلے لمحے پانچ تیر برسے۔ چار پتھریلی دیواروں سے ٹکرائے اور پانچواں اُس کی ٹانگ میں لگا وہ اندر دوڑا۔ تیر کو کھینچ کر باہر نکالا تو خون کا فوارہ زمین پر پڑی ہوئی سونے کی رکابی میں گرا۔ اُس نے ایک پارچہ پھاڑا اور پنڈلی پر کس کر باندھا۔ بعد میں اُسے خیال آیا کہ

پارچے پر بقراط کی لکھی ہوئی نظامِ خون کی تفصیل تھی۔ اُس کی بیوی نے جلدی سے سراسیمگی میں ایک کپڑے کو پھاڑا اور زخم کے اوپر باندھا کیونکہ خون مسلسل پارچے کے ریشوں سے رس رہا تھا۔ زینو کے باپ نے تیر کو دیکھا اُس کی نوک سونے کی نہیں تھی اور دُم پر سونے کا پترا بھی نہیں تھا۔ اُس نے ایک کمان خود پکڑی اور دوسری اپنی بیوی کی طرف پھینکی۔ دیوار کے ایک گول روزن پر باپ نے شست باندھی اور مخالف دیوار کے روزن پر اُس کی بیوی نے۔

''تین لوگ ہیں۔''

باپ نے کہا یہ کہہ کر اُس نے تیر چھوڑا جو ایک سپاہی کے سینے میں ترازو ہو گیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔

''ایک اس طرف ہے۔'' بیوی بولی اُس نے تیر چلایا اور اُسے بھی ڈھیر کر دیا۔ اس دوران مخالف سمت سے تیر آ کر دیواروں سے ٹکراتے رہے۔

''ایک اور ہے'' بیوی نے کہا اور تیر ایک درخت کی اوٹ سے دوڑ کر دوسرے درخت کی جانب جاتے ہوئے آدمی پر چھوڑا جو اُس شخص کے پیٹ میں آر پار ہو گیا۔

''سونے کا کیا ہوگا۔۔۔سونے کا کیا ہوگا!'' باپ کی آنکھوں میں وحشت تھرائی۔ اُس نے صندوق کھولا اور سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو کھانے لگ گیا۔ جب اُسے نگلنے میں دشواری پیش آئی تو اُس نے شراب کے گھونٹ بھرنا شروع کیے۔ شراب نے خوف کو قدرے رفع کیا تو اُسے دیوار کے قریب سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ تیسری دیوار کے روزن سے سپاہی نے دیکھا کہ باپ بڑابڑا رہا ہے۔ ''میں سارا سونا کھا جاؤں گا۔۔۔کھا جاؤں گا۔''

سپاہی نے روزن میں سے تیر چلایا جو باپ کی کھوپڑی میں پیوست ہو گیا۔ زینو کی ماں نے چیخ ماری اور دوڑ کر گھر سے باہر نکل گئی۔ سراسیمگی کے عالم میں وہ ایک درخت کے

پیچھے جا چھپی۔ سپاہی کمرے میں داخل ہوا، خنجر کے ایک وار سے اُس نے زینو کے باپ کا پیٹ چاک کیا اور سونے کی ڈلیاں نکالیں جن پر معدے کی زردی مائل سبز رطوبت لپٹی ہوئی تھی اور نرم گوشت کے ریشے لٹکے ہوئے تھے۔ اُس نے سونا ترکش میں ڈالا مگر جب اُس کی نظر کھلے ہوئے صندوق پر پڑی تو اُس نے اپنی محنت کو حقارت سے دیکھا اس قدر سونا دیکھ کر سپاہی کے ہوش اڑ گئے اُس نے دونوں مٹھیوں میں سونے کی ڈلیاں پکڑیں، گھر سے باہر نکل کر ہوا میں اچھالیں اور قہقہہ بلند کیا۔ درخت کی اوٹ سے تیر نکلا۔ سپاہی کے نرخرے کو چیرتا ہوا پتھریلی دیوار کی دراڑ میں اس طرح پیوست ہوا کہ سپاہی دیوار کا حصہ بن گیا اور اُس کی گردن دراز ہوتی گئی۔

بجلی کے کوندے کی طرح آخری سپاہی زینو کی ماں پر جھپٹا۔ کمان ہاتھ سے چھینی اور کمان کی لکڑی پر تلوار کا وار کیا۔ کمان اپنے ڈورے پر ابابیل کے پروں کی طرح کھل گئی۔ پھر اُس نے جھپٹ کر ترکش عورت کی کمر سے کھینچا تو فرغل کے بند کھل گئے اور ساتھ ہی دیکھنے والے کی آنکھیں۔

زینو گھر کی طرف واپس آ رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ درخت کی اوٹ میں اُس کی ماں کا جسم دھچکے کھا رہا تھا اور اُس کا باپ وارفتگی کے بہاؤ میں ہچکولے لے رہا تھا۔ اگر چہ اُسے درخت کے تنے کی اوٹ میں باپ کا چہرہ نظر نہیں آ تا تھا مگر ماں کے چہرے کی طمانیت زینو سے تقاضا کرتی تھی کہ منظر کی حدود میں قدم نہ رکھے۔ وہ واپس مڑ گیا۔

سپاہی کی وحشت اُس اصل مرغ کی طرح تھی جو چھری کے وار سے باہر نکل جائے اور اُس کی آدھی شہ رگ کٹی ہوئی ہو۔ بالآخر جب اُس کی آنکھیں دھندلائیں تو عورت نے اپنا ہوش مجتمع کرتے ہوئے خنجر اُس کی کمر سے نکالا اور سپاہی کے پیٹ میں پیوست کر دیا عورت کی ٹانگیں ابھی تک سپاہی کے شکنجے میں تھیں بے اختیار سپاہی نے پلک جھپکتے میں خنجر اپنے پیٹ سے نکالا، آخری نظروں سے ایک بار پھر عورت کے جمال کو

دیکھا اور اُس پر گر گیا مگر خون آلود خنجر کا رُخ عورت کے پیٹ کی طرف تھا اور خنجر کے دستے پر ہاتھوں کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

چیخ کی آواز سن کر زینو مڑا۔

باب دوم

ارسطو کی عادت تھی کہ وہ چلتے ہوئے سوچتا تھا اور ساتھ چلتے ہوئے لوگوں سے طویل گفتگو کرتا تھا۔ آج وہ مقدونیہ کے صدر مقام پیلا جا رہا تھا۔ فلپ دوم نے اُسے اپنے بیٹے سکندر کو تعلیم دینے کے لیے مقرر کیا تھا۔ پیلا جانے سے پہلے وہ بحیرۂ تھریسیہ کے ساحل پر رُکا۔ وہ تنہا تھا اور سوچ میں گم تھا۔ ساحل پر اُس نے اپنے جوتے اتارے اور ریت کے نم پر چلنا شروع کیا۔ چلتے چلتے راستے میں اسے ایک فرغل ملا جس کے اوپر جوتے تھے۔ جوتوں کے وزن کی وجہ سے فرغل اُڑ نہیں سکتا تھا مگر پھڑ پھڑاتا تھا۔ اُس نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا اور اُس کے اوپر ارسطو کی سوچ تیرتی اور ارتعاش کرتی تھی۔ اُس نے فرغل سے گریز کرتے ہوئے اپنے سیدھے راستے کو خم دیا اور پھر چلنا شروع کیا وہ سوچ رہا تھا کہ شاہی خاندان کے ساتھ اُس کے خاندان کا تعلق پرانا ہے۔ ارسطو کا باپ فلپ کے باپ کا شاہی طبیب تھا۔ ارسطو اپنی بے پناہ شہرت کی وجہ سے فلپ کی نظروں میں آیا۔ اُس کا آبائی علاقہ سٹگرا ایک جزیرہ نما میں تھا، جو مقدونیہ کا حصہ تھا۔

اگرچہ وہ آفاقی سوچ کا مالک تھا مگر اہلِ یونان اسے مقدونیہ نواز سمجھ کر شک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اسی بنا پر افلاطون کی موت کے بعد وہ ایتھنز کی اکیڈمی کا ناظمِ اعلیٰ نہ بن سکا اور افلاطون نے بسترِ مرگ پر اپنے بھتیجے سپوسپس کو اکیڈمی کا ناظمِ اعلیٰ مقرر کیا۔ جس کا ارسطو کو دُکھ تھا۔ اسی وجہ سے اُس نے اکیڈمی چھوڑ دی تھی۔

ایک چھپا کے کی آواز آئی۔ ارسطو نے دیکھا کہ ایک شخص ساحل پر پڑا افرغل اٹھا کر پہن رہا تھا۔ ارسطو بہت حیران ہوا، اور واپس مڑا۔ اتنے میں اُس شخص نے جوتے پہن لیے تھے۔

''ابھی تو یہاں کوئی نہیں تھا۔ تم اتنی جلدی کیسے نمودار ہوئے؟'' ارسطو نے اُس شخص کے ساتھ کہنی تک ہاتھ ملایا جیسا کہ یونانی کیا کرتے تھے۔

''میں گہرے غوطے میں تھا۔ یہاں گہرے سمندر میں مچھلیوں کے رنگ بہت خوبصورت ہیں اور اطوار بھی اچھے ہیں۔''

ارسطو نے دیکھا کہ ایک انتہائی حسین وجمیل نوجوان اُس سے ہم کلام ہے۔ وہ دونوں ساحل پر چلنے لگے۔ جب نوجوان پر کھلا کہ وہ ارسطو کے ساتھ چل رہا ہے تو اُسے خوشی ہوئی جب زینو کی علم سے مزین گفتگو نے اُسے اپنی طرف کھینچا تو وہ چلتے چلتے رُک گیا۔

بولا:

''دورانِ گفتگو تمہارے ہاتھوں کے اشارے اور لفظوں سے ٹپکتا ہوا علم گواہی دیتا ہے کہ تم میرے ایک ہم جماعت کے بیٹے ہو جو اسی انداز میں مگر ذرا تیز گفتگو کرتا تھا۔ کیا تم کچھ عرصہ پہلے اپنے باپ کے ساتھ افلاطون کی اکیڈمی میں گئے تھے اور وہاں طلبہ کے ساتھ منطق پر بحث کی تھی؟''

لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا اور ارسطو نے اپنی گھنگریالی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ دیر ٹھوڑی کو کھینچے رکھا اور سوچتا رہا پھر بولا:

''زینو نام ہے تمہارا۔۔۔؟ ہاں زینو ہی بتایا گیا تھا مجھے۔۔۔!''

''ہاں میں زینو ہوں۔''

جب دورانِ گفتگو زینو پر کھلا کہ ارسطو سکندر کا شاہی اتالیق مقرر ہوا ہے تو اُس نے بھرپور قہقہہ لگایا ارسطو جواباً مسکرایا۔ زینو نے کہا:

''مدرسے کے استاد اور شاہی اتالیق میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ استاد جو پڑھاتا ہے شاگرد اُسے من وعن قبول کرتا ہے مدرسے کا استاد نصاب اپنے ساتھ لاتا ہے جبکہ شاہی اتالیق کو نصاب شہزادے کے تیور بتایا کرتے ہیں۔ اتالیق وہی پڑھاتا ہے جو شہزادہ چاہتا ہے۔ مدرسے کے شاگرد تعلیم کی سند اس لیے حاصل کرتے ہیں کہ انھیں روزگار ملے گا مگر شہزادہ ہونا بذاتِ خود سب سے بڑی سند ہے۔ شاہی اتالیق کو شہزادے کی ترنگ پڑھانے کا سلیقہ سکھاتی ہے چاہے اتالیق ارسطو ہی کیوں نہ ہو۔''

اس بار ارسطو نے ٹھنڈا قہقہہ لگایا اور زینو جواباً مسکرایا۔

''کیا آپ افلاطونی فلسفے کے مطابق سکندر کو فلسفی بادشاہ بنائیں گے؟'' زینو نے پوچھا۔

''میں اس سلسلے میں افلاطون سے اختلاف کرتا ہوں۔ میں نے تحریر کیا ہے کہ فلسفی ہونا بادشاہ کے لیے ناموافق اور نقصان دہ سکتا ہے فلسفی کو فلسفی اور بادشاہ کو بادشاہ ہونا چاہیے۔ نظامِ حکومت چلانے کے لیے بادشاہ کو فلسفیوں سے رہنمائی حاصل کرنا چاہیے اور اس اہم تحریر کا نام میں نے بادشاہت رکھا ہے۔'' ارسطو نے جواب دیا تو زینو نے طنزاً کہا:

''اور اگر شہزادے کے تیوروں نے حکم صادر کیا کہ مجھے فلسفی بادشاہ بنایا جائے تو آپ کیا کریں گے؟''

ارسطو نے مسکراتی ہوئی خشمگیں نگاہوں سے زینو کی طرف سے ایسے دیکھا جیسے باپ بیٹے کی توجہ اُس کی شرارت کی طرف مبذول کراتا ہے اور پوچھا:

''تم آج کل کیا کرتے ہو اور تمہارے والدین کہاں ہیں؟''

زینو نے بتایا کہ والدین کے انتقال کے بعد وہ مقدونیہ میں تعلیم دے کر روزی کماتا ہے۔اُس کا ایک چھوٹا سا مدرسہ ہے جو شاہی محل سے زیادہ دُور نہیں۔شاہی اصطبل کے عین سامنے ہے۔

''کتنے شاگرد ہیں؟'' ارسطو نے پوچھا۔

''تیرہ ہیں۔'' زینو نے بتایا۔

''ہمیں ملتے رہنا چاہیے۔'' ارسطو نے خلوص سے کہا۔

''کیوں نہیں۔'' زینو نے جواب دیا۔

بیالیس سالہ ارسطو نے سکندر کو کچھ دیر دیکھا اور اُس کے ذہن میں جھانکنے کی کوشش کی۔سکندر تیرہ چودہ سال کا تھا۔انتہائی زیرک باپ کے سائے میں پلا ہوا، محلاتی سازشوں، حلیفوں اور حریفوں کی ریشہ دوانیوں اور جنگ وجدل کے اسرار و موز سے واقف۔اُس کی آنکھوں کا سکوت اور چمکتا ہوا خالی پن بتاتا تھا کہ وہ خوف کی بہت سی قسموں پر قابو پا چکا ہے۔ارسطو یکتائے روزگار تھا۔ارضی وسماوی اور مافوق البشری علوم وفنون کا چلتا پھرتا خزینہ۔سکندر کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ شہزادہ تھا۔زیرِ تعمیر بادشاہ تھا اور اپنی خواب ناک جوانی کی بھرپور تعبیر پانے کے لیے تیار تھا۔ارسطو نے سوچ کے کھلونے نکال کر سکندر کے سامنے رکھے تاکہ اُس کے خیالات پڑھ سکے اور اُس کا رجحان جان سکے ارسطو گویا ہوا:

''فلسفہ سوچ کا عروج ہے۔فلسفی کے مخصوص کردار کی عظمت کو ہم تہذیب و تمدن کے ارتقائی پس منظر سے اخذ کرتے ہیں۔پانچ درجے ہیں تہذیبی ارتقا کے۔پہلی سطح پر انسان کی مجبوری ہوتی ہے کہ وہ ضروریاتِ زندگی تلاش کرے تاکہ جیا جا سکے۔دوسری سطح پر انسان سیاست کے فن کو دریافت کرتا ہے تاکہ نظامِ حکومت چلایا جا سکے۔تیسرا درجہ ہے اُن

فنون کی دریافت کا جن سے مہذب اور شائستہ عادات و اطوار جنم لیتے ہیں۔ چوتھا درجہ ان فنون کے مناسب استعمال کا ہے جو علم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ جب معاشرہ ان چار مدارج سے گزرتا ہے تو ایک مستحکم ریاست وجود میں آتی ہے اور زمین فلسفے کے لیے ہموار ہوتی ہے یہ پانچواں درجہ ہوتا ہے۔

اول اول فلسفہ اشیاء کو مادی وجوہات کے مطابق شناخت کرتا ہے اور جوں جوں ترقی کرتا ہے تو مادے سے مابعدالطبیعاتی اسرار پر کمندیں پھینکتا چلا جاتا ہے اور سماوی نظام کی طرف توجہ مبذول کرتا ہے، پھر فلسفی دیکھتا ہے کہ سماوی نظام کامل اور بے عیب ہے کامل علم تجریدی ریاضیاتی موشگافیوں تک محدود نہیں ہوتا، جیسا کہ افلاطون کہا کرتا تھا۔ اس کا ثبوت صرف ایک نظر ہے جو پورے خلوص کے ساتھ اگر آسمان کی پہنائی پر ڈالی جائے تو کامل نظامِ کائنات کا راز خود بخود آشکار ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے لیے دیکھنے والی نظر چاہیے اور تہذیبی ارتقا کے تمام مدارج کی تکمیل بھی۔''

ارسطو نے آسمان سے نگاہ سکندر کی آنکھوں میں اُتاری تو دیکھا کہ وہ سنتا تھا۔ ارسطو نے بات جاری رکھی:

''چیزیں تین طرح کی ہیں، حیاتی اور فانی، حیاتی اور لافانی، غیر حیاتی اور لافانی۔ پہلی قسم پودوں اور جانوروں کی ہے۔ دوسری اجرامِ فلکی کی ہے۔ تیسری روح کامل اور خدا کی ہے۔'' اس دوران ارسطو نے اپنی نظریں سکندر کے چہرے پر رکھیں پھر اس نے خدائی تصور واضح کیا۔ روح اور ذہن کا جسم سے رشتہ بتایا۔ حیاتیاتی نظام کے ارتقا اور درجہ بندی پر اپنا نقطۂ نظر دیا۔ اخلاقیات اور علمِ بیان پر روشنی ڈالی۔ منطق کے جدلیاتی نظام کو اُجاگر کیا۔ اس دوران وہ سکندر سے گفتگو کرتا تھا اور بے ساختہ سوالوں سے کی گئی باتوں کا اعادہ چاہتا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ سکندر تمام باتیں سنتا تھا۔ ارسطو نے کہا:

''نظام کائنات ہو یا نظام حکومت، عملی علم کی بنیاد مشاہدے پر ہوتی ہے۔ مشاہدہ

ہمیں بتاتا ہے کہ عورتوں کے دانتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔ جب شمالی ہوائیں چلتی ہیں اور عورتوں کو حمل ہوتا ہے تو بچے صحت مند پیدا ہوتے ہیں۔ پاگل کتے کے کاٹنے سے انسان پاگل نہیں ہوتا ہاں جانور ہو جاتے ہیں۔ چھچھوندر کا کاٹنا گھوڑوں کے لیے خطرناک ہے۔ خاص طور پر اگر چھچھوندر حاملہ ہو۔ اگر ہاتھی بے خوابی کا شکار ہوں تو ان کے کاندھوں پر نمک یا زیتون کا تیل ملا جائے اور گرم پانی کی ٹکور کی جائے تو بے خوابی دور ہو جاتی ہے۔ یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں جو مشاہدے پر مبنی ہیں علم و تحقیق کی بنیاد بنتی ہیں۔''

ان ابتدائی لمحوں میں ارسطو کو احساس ہوا کہ سکندر فلسفے، طب اور سائنسی تحقیق میں دلچسپی لیتا ہے۔ ارسطو کو یہ بھی علم تھا کہ یہ علوم اُس مقصد کو پورا نہیں کرتے جس کے لیے بادشاہ نے اسے اتالیق مقرر کیا تھا۔ سکندر کے پتھر سے یادگار مجسمہ تراشنے کے لیے اسے لفظوں کی چھینی پر علم کی ہتھوڑی سے طویل عمل کرنا پڑے گا۔ شام کو ارسطو اکثر شاہی اصطبل کے عین سامنے چھوٹے سے مدرسے میں داخل ہوتا اور پھر زینو کو ساتھ لے کر دور تک باہر نکل جاتا۔ وہ زینو کے حیرت ناک حافظے اور علوم پر اُس کی ذاتی رائے سے متاثر تھا۔ زینو سکندر سے تقریباً چار سال بڑا تھا مگر وہ ارسطو جیسے بے مثل عالم سے انتہائی روانی میں گفتگو کرتا تھا۔ ایک بار ارسطو اور زینو اپنی دھن میں محو چلتے جا رہے تھے کہ انھیں گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ مڑ کر دیکھا تو چند گھڑ سوار نظر آئے جو اُن کے قریب آ کر رُکے۔ سکندر چند سپاہیوں کے ساتھ علاقے کے گشت پر تھا۔ اُس نے ارسطو کو دیکھ کر اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ ارسطو نے جواب دیا۔ شام کے دھندلکے میں سکندر نے زینو کو دیکھا اور اُس کی چمکتی ہوئی آنکھوں کی حدت محسوس کی۔ وہ کچھ دیر زینو کو دیکھتا رہا اور اُس دوران سکندر کا سیاہی مائل خاکی گھوڑا اپنے سموں کی دھیمی لچک سے اُس کا جسم اپنی ننگی پشت پر اُچھالتا اور گراتا رہا۔ سکندر کی رگوں میں اپنے باپ کا مردم شناس لہو گردش کرتا تھا۔ اُس نے ارسطو

سے زینو کا تعارف نہیں مانگا۔ سکندر کے لیے زینو کا غیر معمولی سراپا اور آنکھوں کے لَو دیتے ہوئے چراغ تعارف کے لیے کافی تھے اور ارسطو جیسے یکتائے روزگار انسان کی بے تکلف معیت اس تعارف کی جیتی جاگتی دلیل تھی۔

دورانِ تعلیم اکثر ارسطو سکندر کو بتاتا کہ جس موضوع پر بات جاری ہے وہ گزشتہ شام زینو کے ساتھ زیرِ بحث رہی تھی۔ پھر وہ زینو کی رائے سے سکندر کو آگاہ کرتا۔ سکندر نے دیکھا کہ ارسطو زینو کی بات سنتا تھا۔

زینو کا طرزِ تعلیم غیر رسمی تھا۔ تعلیم کیا تھی، بات چیت تھی۔ روزانہ ایک نئے موضوع پر بات ہوتی۔ ہفتے میں چھ دن گفتگو ہوتی۔ البتہ ایک اوقات نامہ ضرور مقرر تھا۔ مختلف مضامین کو ہفتے کے مختلف دنوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ تاریخ پر گفتگو کرتے ہوئے ایک دن زینو نے کہا:

''تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں یہ مدنظر رکھنا چاہیے کہ دنیا میں یونان کے علاوہ بھی لوگ بستے ہیں۔ یونان جب آثارِ قدیمہ کے ذریعے دریافت ہوا تو اس سے بہت پہلے کانسی ایجاد ہو چکی تھی جو نو حصے تانبے میں ایک حصہ قلعی ملانے سے بنتی ہے اور بہت مضبوط ہوتی ہے۔ دنیا کی قدیم ترین تہذیب دجلہ اور فرات کے کنارے وجود میں آئی۔ دریائے نیل الٹا بہتا ہے یعنی جنوب سے شمال کی طرف اور اس کے کنارے آباد ہونے والی تہذیب بھی بہت پرانی ہے۔ ایران کی تہذیب بھی قدیم ہے اور اس کے مشرق میں بھارت کی تہذیب بہت پرانی ہے۔ بابل کا بادشاہ ہمورابی جانتا تھا کہ ہر عمل کا ردِعمل ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ اس لیے اُس نے قدیم دور میں ضابطۂ قانون وضع کیا جسے پہلا سمیری قانون کہنا چاہیے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت اس قانون کا حصہ تھا۔ اُس نے علاقوں کی انتظامی ذمہ داریاں اور عدالتوں کی کارروائی کا قانون بنایا۔

تہذیبوں کے عروج و زوال میں مادی ترقی اور مسائل کا حصول بنیادی حیثیت کا

حامل ہے۔ تاریخی پس منظر میں مادیت کا نظریہ صرف مادی پیداوار تک محدود نہیں بلکہ معاشرے کی بنیاد کاری پر مبنی ہے اور اب تک ظاہر ہونے والے تمام تر عوامل کا واضح تعین کرتا ہے۔

کوئی عمل مادیت سے بالا تر نظر نہیں آتا۔ خواہ وہ سماجی ہو، سیاسی یا روحانی۔ مادی وسائل کا حصول معاشرتی ترقی کا باعث بنتا رہا اور قومیں اپنے عروج تک پہنچتی رہیں۔ جنگیں قوموں اور ریاستوں کو اپنے انجام تک پہنچاتی رہیں۔ مگر پس منظر میں کارفرما ایک ہی اصول تھا اور وہ تھا مادی وسائل پر قبضہ اور اُس کا ذاتی ملکیت کی صورت میں استعمال۔ اگرچہ زلزلے، قحط اور دوسری زمینی اور آسمانی آفات بھی قوموں اور ریاستوں کے عروج وزوال کا باعث بنیں مگر ان آفات کو ناگزیر سمجھ کر اطمینان کر لیا گیا۔

ہم پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ یونان دنیا کی تاریخ کا زریں ترین باب ہے اور دنیا کا مہذب ترین علاقہ ہے، مگر باقی تہذیبیں بھی یہی کہتی ہیں۔ دارا اول کی سلطنت جو وادی سندھ سے مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ اپنے آپ کو انتظامی صلاحیتوں میں بے مثل سمجھتی تھی۔ اس کے تئیس صوبوں میں صوبے دار اور افسر محاصل انتظامی امور کے ماہر تھے۔ دارا اول کی سلطنت میں بلند ستونوں والی قابلِ دید عمارات اور سڑکیں بنیں۔ وادیٔ سندھ میں موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے شہر وقت کی جدید ترین سہولتوں سے آراستہ تھے۔

یونان زرخیز ذہنوں کی سرزمین ہے۔ بجا ہے مگر دنیا میں ہر جگہ زرخیز ذہن پائے جاتے تھے اور اب بھی موجود ہیں۔ ایران میں زرتشت نے ایک عالم کی سوچ بدل کر رکھ دی۔ کہا جاتا ہے کہ فیثا غورث بابل میں زرتشت سے ملا تھا اور زرتشت نے اسے فلکیات کے کئی نامعلوم اور روشن پہلوؤں سے آگاہ کیا تھا۔ بھارت میں مہا بھارت اور رامائن بہت مضبوط رزمیہ صحیفے ہیں۔ وہاں کی ویدیں اتنی گنجلک ہیں کہ ذہن اُن کی پرتیں کھولتے ہوئے حیرت زدہ ہو جاتا ہے۔ دریائے گنگا کے پار دُنیا کا آخری کنارہ نہیں وہاں سے بہت دُور

ایک ملک چین ہے، جہاں لاؤزو اور کنفیوشس جیسے ذہن پیدا ہوئے، جنھوں نے اپنی سوچ سے تہذیبوں کا پانسہ پلٹا۔

اگر چہ دُنیا اس وقت بہت ترقی کر چکی ہے اور علم کی ترسیل کو روکنا ناممکن ہوتا جارہا ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب مختلف قومیں اور ریاستیں ایک وحدت میں پرودی جائیں گی۔ مگر بات دوبارہ گھوم کر نقطہ آغاز تک آتی ہے اور وہ ہے مادی ترقی، وسائل کا حصول اور سماجی بنت میں مادی اصول کی کارفرمائی۔

یوں ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ علم و دانش اور ایجادات کے سرکش گھوڑے بے روک ٹوک دوڑتے رہتے ہیں۔ پھر تربیت یافتہ ہاتھ اُن کے جبڑوں پر لگامیں اور پشتوں پر زینیں کستے ہیں۔ سب سے اصیل گھوڑے پر بادشاہ سوار ہوتا ہے اور سپہ سالاری کرتا ہے۔ باقی ہجوم لشکر کہلاتا ہے۔ پھر تیروں کی ڈاریں اڑتی ہیں۔ جمے ہوئے خون کی بدبو پھیلتی ہے اور ملک جغرافیہ تبدیل کرتے ہیں۔۔۔ بات کانسی کی ایجاد سے شروع ہوئی تھی۔ کانسی سے ایک طرف مجسمے بنائے جاتے ہیں تو دوسری طرف برچھیوں کے پھل اور نیزوں کی اَنیاں۔ کانسی کی ڈھال بھی بہت مضبوط ہوتی ہے قصور کانسی کا نہیں ہے، کانسی کو شکل دینے کا ہے۔۔۔ اُس کے استعمال کا ہے۔"

اس کے بعد زینو نے ایران اور یونان کے مابین جنگوں کے واقعات سنائے جن میں میراتھان اور پیلو پونیز جنگیں خونریزی میں اپنی مثال آپ تھیں۔ پھر اُس نے یونان کی شہری ریاستوں کے درمیان چپقلش کو واضح کیا جس میں مقدونیہ کا احساسِ کمتری نمایاں تھا۔ یونان میں سونے کی دریافت اور اُس کے سیاسی مضمرات پر روشنی ڈالی۔۔۔ اب گفتگو میں وقفہ ہوا۔

اور پھر ارسطو نے سکندر کو سکندرِ اعظم بنانے کا عمل انتہائی غیر محسوس اور بے ساختہ

انداز میں کیا۔ ارسطو نے کہا:

''تابناک مستقبل پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کی نظر ماضی کا اتنا عمیق مطالعہ کرے کہ وہ حال کی طرح نگاہوں کے سامنے کھڑا نظر آئے۔ یونان کی تاریخ بہت پرانی نہیں ہے۔ مگر تہذیب و تمدن کے اعتبار سے عروج کے اُس مقام پر ہے جہاں دنیا یونانیوں اور غیر مہذب بربری بادشاہتوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ہیروڈوٹس، تھوسیڈائیڈز اور زینوفان کی تاریخ ہمیں یونانی تہذیب کے نشیب و فراز کا دھندلا نقشہ پیش کرتی ہے۔ ہر تاریخ دان کا نقطۂ نظر خارجی ہونے کے ساتھ ساتھ داخلی بھی ہوتا ہے۔ ہیروڈوٹس کے بیان میں مذہب اور علاقائی رسومات کا گہرا رنگ ہے۔ تھوسیڈائیڈز یونان کی اندرونی کشمکش کا مشاہدہ زیادہ گہرائی سے کرتا ہے۔ زینوفان چونکہ خود فوجی تجربہ کار تھا، اس لیے اس کا بیان جنگی معرکوں سے مزین ہے۔ اگر ہم تاریخی موضوع پر ان تمام تحریروں اور یادداشتوں کا موازنہ کریں تو حقیقت کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔ حقیقت کی تلاش ایک سنگلاخ عمل ہے۔

حقیقت پڑھتے پڑھتے جب انسان کی جمالیاتی حس شل ہو جاتی ہے تو افسانوی دھندلکے اس تھکاوٹ کو دور کرتے ہیں۔ شاعری پیدا کرنے کا عمل ہے۔ سائنسدان اور شاعر دونوں لفظوں کی وساطت سے بیان کو عمل میں لاتے ہیں۔ مگر شاعر سائنسدان سے مختلف اس طرح ہوتا ہے کہ وہ پیدا کرتا ہے جبکہ سائنسدان آشکار کرتا ہے۔ یونان چونکہ زرخیز ذہنوں کی سرزمین ہے چنانچہ ہماری شاعری جب کسی موضوع کا انتخاب کرتی ہے تو اس کی جزئیات نگاری کو اجرامِ فلکی کی کاملیت کے برابر لا کھڑا کرتی ہے۔''

یہاں ارسطو نے چند لمحے توقف کیا۔ شاعری کے بارے میں ارسطو کا نقطۂ نظر افلاطون سے مختلف تھا۔ افلاطون شاعروں کی استعداد کو شبے کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ کیونکہ شاعر ہیجان اور برانگیختگی پیدا کر کے جذبات کو پانی کے ریلے کی طرح بہا لے جاتے ہیں۔ افلاطون کے خیال میں رونا ایک جبلی عمل ہے مگر انسان جذبات کے ریلے کو کسی حد تک قابو

میں رکھنا چاہتا ہے۔ اُس کے نزدیک شاعری کے بغیر المیے کی صورت میں جذبات کا شجر جھڑتا ہے۔ مگر شاعری کی موجودگی میں یہ جڑ سے اکھڑ کر بہہ نکلتا ہے۔ ارسطو کا نقطۂ نظر مختلف تھا جس کی بنیاد اخلاقی اور سائنسی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جذبات کے اخراج اور نکاس کے لیے ڈرامائی شاعری لطف اندوزی اور انبساط کا ایک ذریعہ بھی ہے جو ٹریجڈی اور ڈرامائی شاعری کے ذریعے ممکن ہے۔ ارسطو نے شاعری کے اخلاقی قواعد و ضوابط بھی ترتیب دیے تھے۔

مگر یہاں مسئلہ مختلف تھا۔ سکندر کو سکندرِ اعظم بنانے کے لیے ضروری تھا کہ اس کے سامنے عظیم یونانی جنگجوؤں کا نقشہ اتنی شدت اور شد و مد سے کھینچا جائے کہ سکندر کے فکری سمندر میں جوار بھاٹا پیدا ہو۔ یوں کہ سیپیاں رنگ رنگ کے موتی اپنے بطن میں لیے ریت پر جھلملائیں اور ساحل پر سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں کے سموں سے کرچی کرچی ہو جائیں۔ یوں کہ ساحل پر سمندر کا خزانہ عریاں ہو کر سات رنگ کی روشنی دے۔ مگر اس طرح سکندر کے جذبات کا شجر جڑ سے اکھڑ کر بہہ جائے گا اور افلاطونی نظریہ درست ثابت ہوگا جسے ارسطو باطل سمجھتا ہے۔ پھر ارسطو نے سوچا کہ یہ وقت افلاطون اور ارسطو کی نظریاتی جنگ کا نہیں بلکہ سکندر کو سکندرِ اعظم بنانے کا ہے۔ مقصد کے حصول کا ہے۔ اگر سکندر، سکندرِ اعظم بنتا ہے تو کمال بہر حال ارسطو کا ہوگا۔ خواہ پس منظر میں عمل پیرا افلاطونی نظریہ ہی کیوں نہ ہو۔

ارسطو طبعاً خنک مزاج تھا۔ ٹھنڈے لہجے سے گرم موضوعات کا درجۂ حرارت گرا دیا کرتا تھا مگر جب اس نے سکندر کو ہومر کی شاعری پڑھانا شروع کی تو گویا اُس کی جون بدل گئی۔ اس نے اپنے لفظوں میں چنگاریاں اور لہجے میں شعلے بھر لیے اور پھر اس نے دیکھا کہ سکندر کا تجسس، حیرانی اور گفتگو کی گرمجوشی ایک نئی اور بھرپور صورت اختیار کر گئی ہے۔

بے شکل پتھر پر تجربہ کار ضربیں درست درست پڑ رہی تھیں اور مستقبل کے لیے شاہکار تراشا جا رہا تھا۔ جس کے خال وخد ہر ضرب کے ساتھ واضح سے واضح تر ہوتے جا رہے تھے۔

ارسطو نے ہومر کی رزمیہ نظم پڑھنا شروع کی جس کا نام ایلیڈ تھا۔ ایلیڈ کی تمہید ارسطو نے اس طرح باندھی:

''مشاہدے کی بات ہے۔ بعض اوقات پہاڑ کی چوٹی سے چھوٹا سا پتھر لڑھکتا ہے ڈھلوان پر پڑے ہوئے پتھر سے ٹکراتا ہے اور اُسے اپنی رفتار کی رو میں شامل کرتا ہے۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلتا ہے، گڑگڑاہٹ، گھن گرج میں بدل جاتی ہے۔ پتھروں کا آبشار گرنے لگتا ہے۔ پہلے چھوٹے چھوٹے درخت تنوں سے ٹوٹتے ہیں، پھر جڑوں سے اکھڑتے ہیں اور بالا آخر پہاڑ پر پتھروں کا عذاب نازل ہوتا ہے جو وادی کی جانب بڑھتا ہے۔ واقعہ کی ابتدا ایک پتھر کا لڑھکنا ہے۔ جب ٹرائے کا بادشاہ پیرس، سپارٹا آیا وہاں مِنی لاؤس نے اُس کی مدارت کی۔ مگر واپسی پر پیرس مینی لاؤس کی بیوی ہیلن کو اپنے ساتھ اُڑا لے گیا۔ اس میں ہیلن کی مرضی شامل تھی۔ یونان کے شہزادوں نے ایک ہزار سے زیادہ بحری جہازوں کا بیڑہ تیار کیا۔ جس میں عظیم جنگجوؤں کا لشکر سوار ہوا۔ سپہ سالار مینی لاؤس کا بھائی آگامیمنن تھا۔ نو سال تک ٹرائے کے شہر کا محاصرہ رہا۔ دسویں سال شدید جنگ ہوئی اور ٹرائے پر یونانیوں کا قبضہ ہوا۔ ہومر کی ایلیڈ دسویں سال کی طویل داستان ہے۔ مصرعے بحرِ مسدس میں لکھے گئے ہیں۔ ایلیڈ گرتے ہوئے پتھروں گڑگراہٹ ہے۔ اکلیس، اوڈیس، آگامیمنن، پیڑوکلاس اور ہیکٹر جیسے دیو قامت پتھروں میں ہیلن کا چھوٹا سا پتھر بے معنی ہو جاتا ہے۔ حالانکہ اسی پتھر کی حرکت نے گڑگڑاتا ہوا عذاب نازل کیا تھا۔''

ارسطو نے کئی ماہ سکندر کو ایلیڈ پڑھائی۔ یوں کہ سکندر کو میدان جنگ میں لڑتے ہوئے نیم دیوتائی ہیرو اپنی خونخوار اور جبری تفصیلات کے ساتھ نظر آنا شروع ہوئے۔ سکندر

خواب میں بھی اکلیس کو لڑتے ہوئے دیکھتا، اُس کے گھوڑے کے سموں کی دھمک سنتا اور دھرتی میں پڑی ہوئی دراڑیں دیکھتا۔ ایک رات سکندر سویا ہوا تھا۔ خواب میں اکلیس برسرِ پیکار تھا۔ اکلیس کا برچھا ٹرائے کے سپاہی کی کمر چیرتا ہوا اُس کے سینے سے باہر نکلا تو خون کا فوارہ سکندر کے چہرے پر گرا۔ سکندر ہڑبڑا کر اٹھا۔ اپنے رخسار پر ہتھیلی رگڑی اور دیکھا کہ ہاتھوں کی لکیریں خون کی بجائے چہرے کے پسینے سے نم تھیں۔۔۔اُس کے بعد سکندر نے کمر کے بل سونا چھوڑ دیا۔

ایک دن ارسطو نے ایلیڈ کا بیسواں باپ پڑھاتے ہوئے اکلیس کی طاقت کا نقشہ ہومر کے لفظوں میں یوں کھینچا۔

''اور پھر جب دشمن نے اکلیس سے بچنے کے لیے کانسی کی ڈھال کی اوٹ لی تو اکلیس کا برچھا اس شدت سے دھات کو پھاڑتا ہوا نکلا کہ کانسی کی چیخ نکل گئی۔''

سکند بہت دنوں تک اپنے کانوں میں پھٹتی ہوئی دھات سے نکلتی کانسی کی چیخ سنتا رہا۔۔۔ارسطو نے کہا کہ ایلیڈ کا بائیسواں باب ہیکٹر پر اکلیس کے عذاب کا نقشہ یوں کھینچتا ہے۔

''ہیکٹر یوں جھپٹا جیسے عقاب بلندی سے شکار پر ٹوٹتا ہے۔اُس کی تلوار چمکیلی حرکت میں تھی۔ اکلیس نے دھاوا بولا۔اُس کے دل میں وحشت دھڑک رہی تھی۔اکلیس نے چوڑے چکلے سینے کو دھات کی وسعت ڈھال کرتی تھی جس کے کنارے چمکتے اور چارنو کیلے کونے دمکتے تھے۔اکلیس نے سر جھٹکا تو ڈھال کے کناروں اور خود کے کلس کی چمک ٹوٹ کر بکھری۔اکلیس ستاروں بھری رات میں اُس درخشندہ ستارے کی طرح رواں تھا جس کا نام ہیسپر ہے اور جس کی موجودگی باقی ستاروں کی روشنی کو ماند کرتی ہے۔اُس کے برچھے کی نوک سے نکلتی ہوئی روشنی کا رخ ہیکٹر کی طرف تھا۔ وہ نگاہوں کی وحشت سے ہیکٹر کے خال وخد کا معائنہ کرتا تھا جو لوہے میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ ہیکٹر کے بدن کے اُس حصے کی

طرف رجوع کررہا تھا۔ جہاں چھید نے طلوع ہونا تھا۔اُس دوران ہیکٹر کے ذہن میں اپنےعم زاداور ہمزادپیٹر وکلاس کی شبیہہ تھی جسے ہیکٹر نے خون میں نہلایا تھا۔

اکلیس کی نظر ہیکٹر کے جسم پر دوڑتی تھی۔اُس نے ہیکٹر کی ہنسلی کی ہڈی دیکھی جو گردن کو کاندھوں پر بلند کرتی تھی۔ پھر گردن کی رگوں کو دیکھا ،جن کے کٹنے سے روح سرعت سے نکلتی ہے۔جب اکلیس کا روشن پر چھا جو دیودار کی لکڑی سے بنا تھا اور جس کی نوک کانسی سے بوجھل تھی ،ہیکٹر کے گلے کے پار ہوا تو نرخرہ پھٹ گیا۔مگر سانس چلتی تھی اور خون آلود لفظ نکلتے تھے۔ہیکٹر مٹی میں گرا ہوا تھا اور اُس کے اوپر اکلیس کا ہیولیٰ چمکتا تھا اور کہتا تھا:

''او ہیکٹر! تم کیا سمجھتے تھے کہ پیٹر وکلاس کو مار کر تم محفوظ ہو گئے۔کیا میرا خیال تمہارے ذہن میں نہیں آیا۔او احمق! ایک عظیم منتقم اور بدلہ جو ابھی باقی تھا جو پیٹر وکلاس سے کہیں زیادہ شدید ہے۔بحری جہازوں کی کھوکھلاہٹ میں وہ بدلہ موجود تھا۔۔۔اور وہ میں تھا۔میں نے تمہاری قوت کو ریزہ ریزہ کر دیا۔تمہاری لاش کو کتے نوچیں گے۔گدھ تمہارے چیتھڑ اڑائیں گے اور ہوا میں ضیافت کریں گے۔جبکہ یونانی لوگ پیڑ وکلاس کی لاش کی تدفین وضع داری سے کریں گے۔'' چمکتے کلس دار خود کے نیچے ہیکٹر کا دم توڑتا ہوا چہرہ تھا۔اُس نے پھٹے ہوئے نرخرے سے لجاحت بھرے الفاظ اُگلے۔

''میں التماس کرتا ہوں۔۔۔اکلیس! میں تمہارے گھٹنے چھوتا ہوں تمہیں تمہاری زندگی اور تمہارے والدین کا واسطہ میری لاش کو یونانی بحری جہازوں کے سامنے کتوں کے حوالے نہ کرنا۔تم تمام کانسی اور سونا لے لو جو میرے والدین کے پاس ہے۔میری لاش میرے گھر جانے دو جہاں ٹرائے کے لوگ اور اُن کی عورتیں مجھے مرنے کے بعد دفن ہونے کا حق دے سکیں۔۔۔''

ارسطو نے ہمہ تن گوش سکندر کی حیرت کو دیکھا جو لفظ لفظ اپنے ذہن میں وحشت کا نقشہ اُتار رہا تھا۔پھر ارسطو نے اسے بتایا کہ کس طرح وحشت کی رو میں بہتے ہوئے اکلیس

نے ہیکٹر کی درخواست کوٹھکرایا اور اُس کی لاش اپنے رتھ کے پیچھے باندھ کر مٹی اور کوڑے کرکٹ میں پامال کی اور بالآخر ہیکٹر کے باپ کی آنسوؤں بھری اور ہچکچاتی ہوئی درخواست کو قبول کرتے ہوئے لاش اُس کے حوالے کردی۔

سکندر کو عورتوں کے بین سنائے گئے۔ جو انھوں نے ہیکٹر کی بے حرمت لاش کو دیکھ کر کیے۔ ہیکٹر کی ماں نے جب آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے الفاظ لبوں سے انڈیلے تو جواب میں عورتوں نے چیخیں بلند کیں۔ ہیلن نے بھی لاش پر بین کیا۔ ہچکی کے جھٹکوں میں ڈوبی ہوئی سانسوں اور رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں میں ہیکٹر کو تدفین کے حق سے نوازگیا۔ وہ ہیکٹر جو ٹرائے شہر کا سورما تھا۔۔۔ جو اسپ شکن تھا۔

ارسطو نے سکندر کو پنڈار کی غنائی شاعری سے آشنا کیا۔ اُس کی نظم ''پنڈاری'' کے پیچیدہ عروض پر روشنی ڈالی۔ ہومر، پنڈار اور سوفوکلیز کے تشبیہی اور استعاراتی نظام کا موازنہ کیا۔ آرکٹینس کی ''ایتھوپس'' بھی زیر گفتگو ہی جو ٹرائے کی جنگ کا رزمیہ ہے۔ یہ نظم اکلیس کی موت کا حال بیان کرتی ہے۔ جب پیرس کے تیر کی اپالو نے رہنمائی کی اور وہ اکلیس کی ایڑی میں جا کر لگا کیونکہ ایڑی کے علاوہ اکلیس کا تمام جسم ناقابل تسخیر تھا۔ سکندر کو ایک اور یونانی دیو مالائی کردار اجکس سے متعارف کرایا گیا۔ جس نے اکلیس کی لاش کو حاصل کیا مگر جب اکلیس کی زرہ اوڈیسیئس کو دے دی گئی تو اجکس نے خودکشی کرلی۔ ہومر کی دوسری شعری داستان اوڈیسی کو ارسطو نے تیزی سے پڑھایا مگر ایلیڈ پر مہینوں صرف ہوئے سکندر نے ایلیڈ کا اتنا اثر قبول کیا کہ اسے اکلیس کی روح اپنے جسم میں سرایت کرتی محسوس ہوئی اور دل ہی دل میں اُس نے عہد کیا کہ وہ دنیا کو ایلیڈ کا عملی مظاہرہ دکھائے گا اور ہومر کی دہلا دینے والی شاعری کے اساطیری کرداروں کو انسانی شکل دے گا۔ اُس نے اپنی ذات کے لیے اکلیس کا کردار منتخب کیا۔

———————

شام سرمئی دریا رات کے بحرِ اسود میں گر رہا تھا۔ ارسطو اور سکندر محل کے باہر نکلے۔ ارسطو کی عادت تھی کہ وہ چلتے ہوئے سوچتا تھا اور ساتھ چلتے ہوئے لوگوں سے گفتگو کرتا تھا۔ اب وہ سکندر کو اس قابل بنا چکا تھا کہ وہ چلتے ہوئے ارسطو سے گفتگو کر سکے۔ ایک گلی کا موڑ مڑتے ہوئے سکندر کے ذہن میں اچانک ہومر کے مصرعے گونجے اور وہ رک گیا۔ ہومر کی شاعری شروع کرنے سے پہلے اُس نے اپنے ایک مصرع کی گرہ لگائی:

''کسی شخص کے بزدل ہونے کی غمازی اُس کے پاؤں کیا کرتے ہیں۔''

''بزدل کی جلد رنگت بدلتی ہے

ایک رنگ جاتا ہے، ایک آتا ہے

اُسے اپنے دل پر اختیار نہیں رہتا

اُس کے نشست و برخاست میں بے چینی ہوتی ہے

وہ اپنے جسم کا بوجھ کبھی ایک پاؤں پر ڈالتا ہے، کبھی دوسرے پر پھر کہیں جا کر اس کے پاؤں توازن پیدا کرتے ہیں

کہ جسم اُن پر ایستادہ ہو سکے

اُس کے سینے میں دل پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتا ہے

کیونکہ اسے سامنے موت کھڑی نظر آتی ہے

خوف سے اُس کے دانت بجتے ہیں

مگر بہادر کی جلد رنگت نہیں بدلتی

وہ بے خوف ہوتا ہے

وہ پاؤں جما کر مورچہ بناتا ہے

اُس کی دعا ہوتی ہے کہ وہ جنگ کو جلد از جلد انجام تک پہنچائے

کوئی شخص اُس کی طاقت شل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور نہ ہی اُس کے

عسکری ہاتھوں سے ہنر کاری چھین سکتا ہے۔ اگر وہ برچھیوں کے پیہم وار سے گھائل بھی ہو جائے تو کوئی ہتھیار اُس کی گردن کی پشت اور پیٹھ کو چھلنی نہیں کر سکتا۔۔۔''

دیوار سے سائے سے زینو نکلا جو سارا منظر دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ سکندر کے ہونٹوں پر ہومر کے لفظ مر گئے۔ زینو ارسطو سے واقف تھا جب اُس نے دیکھا کہ ارسطو راہ چلتے ہوئے سکندر سے بات کر رہا ہے تو اُس نے ارسطو سے کہا:

''کیا آپ سکندر کو چلنا سکھا رہے ہیں؟''

ارسطو نے زینو کی بجائے فوراً سکندر کو دیکھا۔ زینو کی بات سن کر سکندر کے رخساروں پر شعلہ دوڑ گیا اور چہرے پر غضب، خفت اور بے رحمی کے تیوروں نے سایہ کیا۔

ارسطو فوراً بولا:

''شہزادوں اور بادشاہوں کو چلنا کون سکھا سکتا ہے، ان کے سائے میں تو ریاستیں چلا کرتی ہیں۔'' یہ کہہ کر ارسطو نے ٹھنڈی ہنسی سکندر کے تیوروں پر پھینکی۔ مگر اُسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سکندر کے تیور تیزی سے پگھل رہے ہیں اور وہ ضبط کر رہا ہے۔ زینو نے سکندر سے کہا:

''میں نے تمہارے لفظوں کو رستے میں روک لیا، تم اپنی خطابت جاری رکھو۔''

سکندر نے کچھ دیر سوچا اور پھر لفظوں کی ڈور جوڑتے ہوئے بولا:

''۔۔۔اگر وہ برچھیوں کے پیہم وار سے گھائل بھی ہو جائے تو کوئی ہتھیار اُس کی گردن کی پشت اور پیٹھ چھلنی نہیں کر سکتا۔ ہاں اس کے سینے اور شکم کو پھاڑ سکتا ہے۔۔۔''

اس بار سکندر کی خطابت کا لہجہ دھیما اور ڈھلکا ہوا تھا۔ زینو نے سن کر تبسم کیا اور سکندر سے کہا:

ایلییڈ کے تیرہویں باپ کے یہ مصرعے سن کر اندازہ ہوا کہ تم رزمیہ شاعری اور فنِ خطابت کو پسند کرتے ہو۔ ارسطو نے تمہیں یقیناً بتایا ہوگا کہ علم بیان اور فن خطابت کا

مقصد اُکسانا، ترغیب دلانا اور برانگیختہ کرنا ہے۔ جدلیات کے برعکس فن خطابت سائنس نہیں بلکہ فن ہے۔ ارسطو کہتے ہیں کہ فن خطابت کے ذریعے ترغیب دلانے کے تین عناصر ہیں۔ پہلا خطابت کرنے والے کا اپنا کردار ہے، دوسرا سننے والے کے جذبات کی برانگیختگی اور تیسرا بیان کی گئی بات کا بین ثبوت اور واضح دلیل ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو ارسطو شاعری اور خطابت کی مماثلت کو تسلیم کرتے ہیں اور اس کے اخلاقی، سیاسی اور تعلیمی پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ البتہ جہاں تک شاعرانہ ٹریجڈی کا تعلق ہے تو ارسطو اُس کی واضح شکل کو مانتے ہیں۔ اسے نقالی کہتے ہیں، جہاں تک رزمیہ شاعری کا تعلق ہے تو ارسطو اس کا موازنہ ڈرامے کے ساتھ کرتے ہیں اور ڈرامے کی افادیت کو بالاتر سمجھتے ہیں۔ ٹریجک ہیرو کو انسانیت کے عروج پر سمجھتے ہیں۔ بعض اوقات یہ ہیرو انسانیت کی بلند ترین سطح سے اٹھ کر ماورائی اور اساطیری روپ اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ساری باتیں تو ارسطو نے تمھیں تفصیل کے ساتھ بتائی ہوں گی۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے ہومر کے جادوئی الفاظ کا اثر خطرناک حد تک قبول کیا ہے۔ یوں کہ ایلیڈ کا جادو تمہارے سر کے اوپر ہیولا بن کر ناچتا ہے۔ شاید ارسطو نے جادوئی شاعری کے خطرناک مضمرات کو نظرانداز کر دیا ہے جس کی طرف افلاطون نے اشارہ کیا۔ میرے طلبہ نے بھی ایلیڈ کو تفصیلاً پڑھا ہے مگر اس کا مطالعہ ایک یونانی داستان، ڈرامے اور ٹریجڈی کے حوالے سے کیا ہے۔ منظرنگاری پر داد دی ہے لفظوں کے چناؤ پر خوشگوار حیرت کا اظہار کیا ہے۔ جزئیات نگاری کو پسند کیا ہے۔ اساطیری کرداروں کی بے پناہ قوت پر رشک کیا ہے اور انھی سُورماؤں کی دیوتاؤں کے ہاتھوں بے بسی پر تبسم کیا ہے۔ مگر تم جس عقیدت اور بے ساختگی سے خطابی انداز میں ہومر کے مصرعے گرج گرج کر پڑھ رہے ہو، وہ تمہارے عزائم کا پتہ دیتے ہیں۔''

سکندر نے زندگی میں پہلی بار اتنی براہِ راست اور جارحانہ بات سنی تو اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ مگر فوراً چہرے کا اصل رنگ لوٹ آیا اور اُس نے جواباً کہا:

''تمہارے طلبہ بہت سے ہوں گے مگر اُن میں کوئی سکندر نہیں ہے اگر تم نے زندگی میں کبھی سونا دیکھا ہے تو لوہے اور سونے کے فرق کو اچھی طرح جانتے ہو گے''۔

زینو نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور سوال کیا:

''ٹرائے کی جنگ کے کن کرداروں نے تمہیں متاثر کیا؟''

''اکلیس اور ایجکس نے۔'' سکندر نے فوراً کہا۔

زینو مسکرایا اور بولا:

''اکلیس میں تمہیں اپنا مستقبل نظر آتا ہے اور ایجکس میں ارسطو کا ماضی دکھائی دیتا ہے۔ سکندر! تم اکلیس کی طرح ناقابلِ تسخیر بننا چاہتے ہو مگر اُس کی ایڑی کی طرف دھیان نہیں دیتے جو بہت غیر محفوظ تھی۔ جب ایک تیر نے اُس میں شگاف کیا تو اکلیس جیسا نیم دیوتائی پیکر مٹی میں مل گیا۔ باقی رہا ایجکس ۔۔۔تو اُس نے اکلیس کی لاش کو حاصل کیا۔ مگر جب اکلیس کی ڈھال کی بجائے اوڈیس کو دے دی گئی تو اس نے خودکشی کر کے زندگی سے ناطہ اس طرح توڑ دیا جس طرح ارسطو نے افلاطون کی اکیڈمی سے توڑا تھا۔ کیونکہ افلاطون کی موت پر ارسطو کی بجائے سپوسپس کو اکیڈمی کا ناظمِ اعلیٰ بنا دیا گیا تھا۔ ہم لوگ زندگی کے حقائق کو بالائے طاق رکھ کر اساطیری کرداروں کی روح اپنے جسموں میں حلول کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک ایسی خوش فہمی ہے جو انسان کی سوچ کو بلوغت تک نہیں پہنچنے دیتی۔''

تینوں کچھ دیر خاموش رہے، پھر زینو وہاں سے چلا۔ ابھی اُس نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ سکندر نے بلند آواز میں کہا:

''اکلیس میرے آباؤ اجداد میں سے تھا اور اب اُس کی روح میرے جسم میں ہے۔ کوئی بھی میرے ارادوں کو متزلزل نہیں کر سکتا۔ میرے پختہ عزم کا تیر ارادے کی کمان سے نکل چکا ہے۔ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو واپس نہیں لایا جا سکتا۔''

زینو نے جب یہ بات سنی تو اُسے کمان سے نکلا ہوا تیر یاد آیا۔ جسے کوہی ابابیل اُڑکر اپنے پنجوں میں دبوچتی ہے اور واپس لاتی ہے۔ اُس نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جانتا تھا کہ استاد باکمال ہو تو شاگرد کے حواس پر چھا جاتا ہے۔ ارسطو کی کمان سے سکندر کا تیر اتنی رفتار سے نکلا تھا کہ ہوا کی رگڑ سے اُس پر آگ سرسراتی تھی۔ کوہی ابابیل کی رفتار تیر کے مقابلے میں ہیچ تھی۔

''کیا ارسطو سب سے بڑے عالم ہیں؟''

ایک طالب علم نے زینو سے سوال کیا۔ زینو اپنے تیرہ ساتھیوں کے ساتھ آج کل تھیبس میں تھا۔ ہوا یوں کہ طالب علموں کے اصرار پر زینو انہیں ایتھنز لے گیا، جہاں افلاطون کی اکیڈمی میں انھوں نے چند دن گزارے، وہاں اکیڈمی کے طلباء کے ساتھ ان کی یادگار بات چیت ہوئی اور زوردار مباحثے ہوئے، مقدونیہ واپسی پر زینو اور اُس کے ساتھی تھیپس کے راستے پر سفر کر رہے تھے۔ وہاں انھوں نے عظیم غنائی شاعر پنڈار کا گھر دیکھا۔ اُس کے عزیز و اقارب سے ملے۔ پنڈار کی شاعری کے قلمی نمونے دیکھے۔ وہ چلتے چلتے شہر سے باہر نکلے اور درختوں کے جھنڈ میں بیٹھ گئے۔ حسبِ معمول بات چیت کا آغاز ہوا:

''ہاں! ارسطو بہت بڑے عالم ہیں۔'' زینو نے جواب دیا۔

فلپ دوم قتل ہو چکا تھا۔ مرتے وقت اُس نے ہاتھ اپنے سر پر پھیرے۔ ہاتھوں کا پیالہ بنایا۔ پیالے میں اُس کا خواب تھا۔ دم توڑتے ہوئے تصور میں اُس نے سکندر کا ہیولا طلب کیا اور ہاتھ سکندر کے سر پر پھیرے۔ خواب سکندر کے سر میں سرایت کر گیا۔ فلپ نے وہی عمل کیا جو اکلیس کی ماں نے نومولود اکلیس کو دریائے سٹکس میں ڈبو کر کیا تھا۔ اُس نے اکلیس کو ایڑی سے پکڑ کر دریا میں ایک لمحے کے لیے ڈبویا تھا۔ ایڑی کے علاوہ اکلیس

ناقابلِ تسخیر ہو چکا تھا۔فلپ کا خواب تھا کہ سارا یونان مقدونیہ کی بادشاہت کے زیرِ سایہ رہے۔اس خواب کی تعبیر کا ایک ہی طریقہ تھا۔وہ یہ کہ یونان کو ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار کیا جائے کہ متحد یونان ہی دارائی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتا ہے۔

سکندر نے کام کا آغاز کیا۔اُس نے یونان کا ذہن ماؤف کرنے کے لیے یہ طے کیا کہ جبر و استبداد کی خوں رنگ مثال قائم کی جائے۔سب سے پہلے اُس نے باپ کے ممکنہ قاتلوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔الریا پر چڑھائی کی تو شہر اور بستیاں جانوروں اور پرندوں کے حوالے کر دی گئیں۔جن کے پنجوں، دانتوں اور چونچوں پر مردہ جسموں کے ریشے جمے ہوئے تھے۔تھیبیس میں یہ مشہور ہو گیا کہ سکندر الریا کی جنگ میں مارا گیا ہے۔ابھی تھیبیس میں سیاسی مستقبل کی منظر نگاری ہو رہی تھی کہ سکندر کا لشکر طوفان کی طرح شہر پر ٹوٹا اور خون میں لتھڑی چیخیں ہوا میں بلند ہونا شروع ہوئیں۔سکندر کے حکم پر تمام شہر کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔عورتوں اور بچوں کو ذبح کیا گیا۔مردوں کو قتل کیا گیا۔بچے کھچے لوگوں کے مقدر میں غلامی آئی۔

تھیبیس شہر کے مضافات میں، درختوں کے گھنے جھنڈ کے اندر اب جدلیاتی نظام کے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی۔زینو نے قہقہہ لگایا اور کہا:

''ہاں! ہاں! اُس کا نام بھی زینو تھا۔وہ پارمینی ڈیز کا شاگرد تھا۔سوال و جواب کے ذریعے جدلیاتی گفتگو کا آغاز اُسی زینو نے کیا تھا۔مگر اُس کی بھرپور اور عملی تصویر سقراط کی شکل میں سامنے آئی۔سقراط نے سوال و جواب کی وساطت سے حقائق کو بے نقاب کیا۔۔۔شام گہری ہو رہی ہے۔آج کی رات تھیبیس میں بسر کی جائے۔صبح سفر کا آغاز کریں گے۔''

ابھی زینو اور اُس کے ساتھی شہر سے ذرا فاصلے پر تھے کہ ایک مسلح فوجی دستے کو سامنے کھڑا پایا۔فوجی قریب آئے تو زینو نے دیکھا کہ ان کے خود میلے ہیں اور وہ چاندنی

میں چمکتے نہیں۔اُن کی ڈھالیں اور زرہ بکتر بھی جھلملانے سے عاری ہیں۔ذرا اور قریب آنے پر خون کی بدبو کا بھبھوکا ساری داستان سنا گیا۔ایک فوجی نے کرختگی سے پوچھا:

''تم کون ہو؟''

زینو نے باقی ساتھیوں کو رُکنے کا اشارہ کیا۔خود اُن کے آگے کھڑا ہو گیا اور جواب دیا:

''ہم لوگ ہیں۔''

فوجی نے پوچھا:''تمہارا تعلق کس علاقے سے ہے؟''

زینو نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا اور بولا:

''جہاں کھڑے ہیں وہیں سے ہے۔''

اس کے بعد زینو دو قدم اور آگے بڑھا اور پاؤں کی طرف دیکھ کر بولا۔

''پہلے میں وہاں سے تھا اور اب یہاں سے ہوں۔''

''تو گویا تھیبیس سے ہو۔۔۔اور ابھی تک زندہ ہو۔۔۔زندہ رہ کر سکندر کی حکم عدولی کر رہے ہو۔'' یہ کہہ کر سپاہی نے برچھی کو اپنے بازو کی کمان میں بھرا اور تیر کی طرح زینو کی طرف پھینکا۔زینو اپنی طرف آتی ہوئی برچھی کو آنکھ بھر کے دیکھ رہا تھا۔جوں ہی سپاہی نے برچھی زینو کی طرف پھینکی تو ساتھ ہی باقی سپاہیوں کی طرف سے تیروں کی بارش منہ زور تھپیڑے کی طرح زینو اور اُس کے ساتھیوں پر برسی۔زینو اپنی طرف آتی ہوئی برچھی کو آنکھ بھر کے دیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی تیروں کی بارش کو بھی۔برچھی زینو کے ماتھے سے ذرا فاصلے پر آ کر سنسناہٹ کے ساتھ رُکی اور زینو ہوا میں معلق برچھی کو دیکھ رہا تھا۔اُس کی دائیں آنکھ برچھی کے ایک جانب اور بائیں برچھی کی دوسری جانب تھی۔برچھی کا آہنی پھل اگرچہ خاموش تھا مگر دیودار کا لمبا دستہ ایک تسلسل سے کپکپا رہا تھا۔سپاہیوں نے گھوڑوں کی لگامیں

اتنے زور سے کھینچیں کہ کئی گھوڑوں کے جبڑے چیر کھا گئے اور انھوں نے اگلے سم ہوا میں معلق کیے۔لرزہ خیز ہنہناہٹ کے ساتھ گھوڑے اپنے پچھلے سموں پر گھومے۔دستہ واپس پلٹا اور دھول میں گم ہوگیا، جو سپاہی گھوڑوں سے گر گئے وہ پوری رفتار سے واپس دوڑے۔اس دوران اُن کے گھائل جسموں سے درد غائب ہوگیا۔

ہاتھ میں مشعل اٹھائے سکندر جب وہاں پہنچا تو زینو اپنے تیرہ ساتھیوں کی لاشوں کا نوحہ بن کران کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔مشعل ایک برچھی پر لرز رہی تھی۔سکندر اکیلا آیا تھا۔اُس نے برچھی کا پھل زمین پر مار کر مشعل کو ایستادہ کیا۔دونوں دیر تک خاموش رہے۔سکندر نے تھرتھراتے ہوئے جسم کے ساتھ اپنے گھٹنے زمین پر گرائے اور چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔سکندر اکیلا آیا تھا۔اُس کے جسم پر کوئی ہتھیار نہیں تھا بس ایک برچھی جس کے سر پر آگ دہک رہی تھی۔اُس کی روتی ہوئی آواز پھٹ گئی اور وہ زینو کے پاؤں پر سر رکھ کر سسکنے لگا۔زینو نے سکندر کے بال اپنی مٹھی میں پکڑے اور ایک جھٹکے سے اُس کا چہرہ اپنے چہرے کے برابر لا کر سپاٹ آواز میں بولا۔

''کیا چاہتے ہو؟''

یونان کو ڈرانا چاہتے تھے سو وہ ڈر گیا۔

اب کیا چاہتے ہو؟

دارا کی سلطنت حاصل کرنا چاہتے ہو۔

اپنے آپ کو اتنا پھیلا کر کیا کرو گے؟ تم پھیلو گے تو خون پھیلے گا۔کیا تم نے ارسطو کی میانہ روی کے سنہری اصول نہیں پڑھے؟ ارسطو کہتا ہے کہ دو انتہاؤں کے درمیان میانہ روی کا سنہرا راستہ ہے۔بزدلی اور باعاقبت اندیش بے باکی دو انتہائیں ہیں اور بہادری میانہ روی ہے۔بے دریغ قتل و غارت کہاں کی بہادری ہے۔۔۔اب ارسطو بھی تمہیں میں پڑھاؤں۔۔۔؟ میں پڑھاؤں تمہیں ارسطو۔۔۔؟''

یہ کہہ کر زینو نے سکندر کے جکڑے ہوئے بالوں کو جھٹکا دیا تو سکندر پشت کے بل گرا۔ زینو کھڑا ہو گیا۔سکندر نے زمین پر پڑے ہوئے دیکھا کہ زینو کی آنکھیں مشعل کی طرح روشن ہیں۔

وہ لرز گیا۔زینو بولا:

''کیا تم اس بات پر یقین رکھتے ہو کہ مشعل بردار برچھی، جو زمین میں گڑی ہوئی ہے اگر میں کھینچ کر تمہارے سینے میں ماروں تو یہ دستے سمیت زمین میں دُور تک دھنس جائے گی؟ کیا تم اس بات پر یقین رکھتے ہو کہ جب یہ برچھی زمین میں دھنس جائے گی تو مشعل کی جگہ تمہارے دل کے چیتھڑے ہوں گے؟''

سکندر نے کہا'' ہاں میں یقین رکھتا ہوں۔''

زینو بولا'' مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔کیا تم اس کی وجہ جانتے ہو؟''

سکندر نے کہا''نہیں۔''

زینو بولا:

''اس کی دو وجوہات ہیں۔ایک تو یہ کہ میں قتل نہیں کرتا اور دوسری یہ کہ اگر تم مر بھی گئے تو تمہاری فوج ایک ریلے کی شکل اختیار کر گئی ہے۔کوئی دوسرا سکندر اس کی سپہ سالاری کرے گا۔

فوج بنانا اتنا مشکل کام نہیں ہوتا مگر اس فوج کو تیار ذہن کے ساتھ ایک عملی رفتار میں لے آنا ایک فن ہے اور یہ فن تمہیں ورثے میں ملا ہے۔تم اپنی فوج کو اُس سطح پر لے آئے ہو جہاں سے واپسی کے راستے مفقود ہو جاتے ہیں۔اس وقت تمہاری فوج ایک آبشار کی طرح پہاڑی سے گر رہی ہے۔مگر یاد رکھنا! آبشاروں کو جھیل بننا پڑتا ہے۔جھیل کو دریا بننے کے لیے سنگلاخ بند توڑنے پڑتے ہیں۔میرا مطلب فوج پالنے سے ہے۔فوج پالنے کے لیے تمہیں ہر قسم کے جتن کرنے پڑیں گے۔جن کی اندوہنا کی کی کوئی حد نہیں۔کیا مالِ غنیمت

کے علاوہ تمہارے پاس فوج پالنے کا کوئی اور ذریعہ ہے؟''

سکندر نے کہا ''نہیں ہے۔''

زینو بولا ''اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ یہاں سے کچھ دُور ایک جزیرہ ہے جہاں اس قدر سونا ہے کہ یونان تو کیا، دارائی سلطنت تو کیا۔۔۔ساری دنیا کی قیمت لگائی جا سکتی ہے۔۔۔تو تم مانو گے؟''

سکندر نے کہا ''تم کہتے ہو تو مانتا ہوں۔''

زینو بولا ''میں ساری دولت تمہیں پیش کر سکتا ہوں مگر اس کی ایک شرط ہے۔''

سکندر آہستہ آہستہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا اور پچھلے قدموں پر کچھ دیر چلتا رہا تاکہ عقب میں جلتی ہوئی مشعل کے انعکاس کو زینو کی آنکھوں سے توڑ سکے۔

''کیا شرط ہے؟'' سکندر نے پوچھا۔

زینو سکندر کے قریب آیا۔ مشعل کی جگہ اُس کی آنکھوں میں چاند چمکنے لگا۔

''تمہیں فوج رکھنے کا شوق ہے۔ تم فوج رکھو، اس کی پرورش کرو، مگر یونان تک محدود رہو۔ تم ایک امیر بادشاہ بن سکتے ہو۔ اگرچہ ارسطو کی طرح میں بھی بادشاہت کے خلاف ہوں۔ شہری ریاستوں کا اصول اچھا ہے۔ مختصر آبادی کی ریاست زیادہ منظّم طریقے سے چل سکتی ہے۔ مگر تم حالات کو اس نہج پر لے آئے ہو کہ بادشاہت کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ تو ٹھیک ہے۔۔۔تم ملک یونان کے بادشاہ بنو۔ دارا اتنا امیر نہیں ہے جتنے تم ہو جاؤ گے۔ بادشاہت اگر امیر ہو تو سرحدیں محفوظ ہو جاتی ہیں اور اندرون ملک سکون رہتا ہے۔۔۔تو شرط یہ ہے کہ خزانہ حاصل کرنے کے بعد تم یونان تک محدود رہو گے۔''

سکندر نے زینو کو سنا اور خاموش رہا۔ زینو نے اپنی شرط دہرائی تو سکندر نے کہا:

''میں کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر تمہارے غضب سے ڈرتا ہوں۔''

زینو بولا ''بلا جھجک کہو۔''

سکندر نے کہا ''جب میں پیدا ہوا تو میری کم عمری اور بلند بختی کی پیشن گوئی کر دی گئی تھی۔ میں اپنے بخت کو سورج کی طرح چمکتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں ستاروں کی طرح ٹمٹماتا ہوا نہیں۔ سکندرِ اعظم فاتح عالم بنے گا۔ نہ صرف یہ کہ سکندر دارا کی رعونت خاک میں ملائے گا بلکہ پوری دنیا کو مہا یونان کی شکل دے گا۔ اس طرح نہ صرف یونان کا اندرونی خلفشار ہمیشہ کے لیے دم توڑ دے گا بلکہ دارائی ریشہ دوانیوں کا بھی مستقل خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر سکندر خزانہ حاصل کر کے یونان تک محدود ہو گیا تو دنیا کو سکندر کا علم کیسے ہو گا؟ اس طرح بخت کا سورج طلوع نہیں ہو گا۔ فقط مقدر کا ستارہ تاریخ کے آسمان پر ٹمٹمائے گا۔۔۔۔ اور ستارے تو بے شمار ہیں۔''

زینو بولا ''تم اپنی انا اور سر میں سمائے ہوئے عزم کو پیشن گوئی اور بخت کا نام دے رہے ہو۔ لفظوں کے چناؤ میں احتیاط کیا کرو۔ ان چمکتے ہوئے لفظوں سے تم اپنی فوج کی آنکھیں خیرہ کر کے سپہ سالاری تو کر سکتے ہو لیکن حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتے۔''

سکندر نے کہا ''تم دارا کی طرف داری کر رہے ہو۔''

زینو نے تیرہ لاشوں کی طرف اشارہ کیا اور بولا ''میں ان کی طرف داری کر رہا ہوں۔ بے دریغ اور اندھی قتل و غارت سے ایسے لوگ بھی مارے جاتے ہیں۔ کیا معلوم ان میں کتنے ارسطو تھے اور کتنے پنڈار، کتنے دیموستھیس اور کتنے ہومر، تلوار کی دھار اور نیزے کی اَنی اندھی ہوتی ہے۔''

سکندر نے کہا ''میں نے سارا تھیبیس شہر یا قتل کر دیا یا غلام بنا لیا۔ مگر پنڈار کے گھر کو تباہ نہیں کیا اور نہ ہی اُس کے خاندان کو گزند پہنچایا۔ میرے ہتھیار آنکھیں رکھتے ہیں اور قتل و غارت انصاف کے ساتھ کرتے ہیں۔''

زینو نے پھر تیرہ لاشوں کی طرف اشارہ کیا اور بولا:

''ہتھیاروں کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔ تلوار کی آب اور آنکھ کے پانی میں فرق ہوتا

ہے۔''

سکندر نے نظریں جھکا کر سوچا۔اپنے جسم کا بوجھ پہلے دائیں پاؤں پر ڈالا پھر بائیں پاؤں پر اور پھر توازن سے جسم کو ٹھہرا کر کہا۔

''شہر کی قتل و غارت سے میرا دل بھاری ہے۔مگر میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔تم یہ بات سمجھتے ہو۔۔۔میرا مطلب ہے تم یہ بات سمجھتے ہو کہ میں یہی بہتر سمجھتا تھا۔میں خون کے داغ اپنے دامن سے دھونا چاہتا ہوں۔ میں ڈلفی کی یاترا کروں گا اور وہاں جا کر اپالو سے معافی مانگوں گا۔''

''اپالو کو یہیں بلا لیتے ہیں۔'' زینو بولا۔

سکندر نے جھرجھری لی اور چلایا۔۔۔''نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں تم مجھے ڈراتے ہو۔ مجھے تمہارا کوئی مشورہ نہیں چاہیے۔ مجھے سکندرِ اعظم بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔اگر تم مجھے مار بھی دو گے تو فوج دوسرا سکندر پیدا کرنے کے لیے تیار ہے۔سکندر کے زیرِ نگیں ہونے کے لیے تمام دنیا منتظر ہے۔ مجھے تمہارا خزانہ نہیں چاہیے کیونکہ بات اب خزانے سے بہت آگے نکل گئی ہے۔''

یہ کہہ کر سکندر تیزی سے مڑا۔ برچھی کو ایک جھٹکے سے اُکھاڑا تو مشعل پھڑ پھڑائی۔ زینو جاتی ہوئی مشعل کو دیر تک دیکھتا رہا۔

———————

ایتھنز سے کچھ فاصلے پر سمندر تھا۔ جب زینو وہاں پہنچا تو بہت سے کشتی ساز کام کر رہے تھے۔اُس نے ایک درمیانی عمر کے کشتی ساز کا دستِ ہنر پہچانا اور اُس سے کہا:

''ایک کشتی بنوانا چاہتا ہوں۔''

پینتالیس چھیالیس سالہ کشتی ساز نے پہلے زینو کو عامیانہ نظر سے دیکھا مگر پھر اُس کی نظر گہری ہوتی چلی گئی۔ کچھ دیر غور سے دیکھنے کے بعد اُس نے جواب دیا۔

’’بنا دوں گا۔‘‘

’’مگر کشتی کی ساخت اور پیمائش کے بارے میں میری بات ماننا پڑے گی۔‘‘

زینو بولا:

’’بتائیں۔‘‘ کشتی ساز نے پوچھا۔

جب کشتی ساز نے کشتی کی جسامت، اُس کے بادبانوں کی اونچائی اور دھات کی عمل کاری کو تفصیل کے ساتھ سنا تو اُس کی آنکھیں حیرت سے اُبل پڑیں۔ اُس نے ٹوٹے لفظوں سے کہا۔

’’اتنی بڑی کشتی۔۔۔یعنی اتنی بڑی۔۔۔؟؟‘‘

’’کتنی لاگت آئے گی۔‘‘ زینو نے پوچھا۔

’’کاریگروں کا ایک دستہ چاہیے سامان کچھ ایتھنز سے لانا پڑے گا اور کچھ تھیبس سے۔۔۔مگر تھیبس میں تو ویرانی چیختی ہے چنانچہ میرا تھان سے لانا پڑے گا اور یہ سارا جنگل تو خیر لکڑی کے لیے کافی ہوگا۔‘‘ کشتی ساز نے دُور ایک جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’یہ سارا جنگل نہیں کٹے گا۔ان میں کچھ درختوں پر میں نشان لگا دوں گا انھیں مت کاٹنا۔ جہاں تک کاریگروں اور سامان کا تعلق ہے تو وہ تم پر ہے۔کتنی لاگت آئے گی؟‘‘

’’مجھے سونے میں تولنا پڑے گا۔۔۔ہاہاہاہا۔‘‘ کشتی ساز نے لاگت بتاتے ہوئے فخریہ قہقہہ لگایا۔

’’کتنی بار۔‘‘ زینو نے اطمینان سے پوچھا۔

کشتی ساز کا قہقہہ اُس کے کھلے منہ سے اُڑ کر اُس کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں جا بیٹھا۔’’دو بار۔۔۔‘‘ کشتی ران نے دائیں ہاتھ کی مٹھی بنائی اور لرزتی ہوئی دو انگلیاں ہوا

میں بلند ہوئیں۔

''تین بار تولوں گا۔ کیونکہ کشتیاں بنا بنا کر تمہارا وزن جھڑ گیا ہے۔۔۔کشتی بننے میں کتنی دیر لگے گی؟'' زینو بولا۔

کشتی ران نے اپنی حیرت جھاڑنے کے لیے سر جھٹکا اور اچھی طرح سوچ کر کہا۔

''چھ سے سات ماہ۔''

''کل سے کام شروع کر دینا۔ کیونکہ ایسا لگتا ہے آج کا دن حیرت میں گزرے گا۔'' زینو مسکرایا۔ کشتی ساز ہنستے ہنستے ساحل کی ریت پر گر پڑا اور لیٹے لیٹے بولا:

''کل سے۔۔۔کل سے شروع۔۔۔کام شروع۔''

زینو کچھ دن ایتھنز میں رہا۔ کبھی کبھار وہ افلاطون کی اکیڈمی میں کچھ وقت گزارتا۔ ایک دن وہ اکیڈمی گیا تو وہاں فلکیات پر بات ہو رہی تھی ایک صاحب لیکچر دے رہے تھے۔

''فلکیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول وہ اجسام جو چاند سے بلند ہیں اور دوم جو چاند سے نیچے ہیں۔ چاند سے نیچے جو چیزیں ہیں، وہ پیدا ہوتی اور مٹتی رہتی ہیں۔ چاند کے اوپر کے تمام اجسام مستقل ہیں۔ یعنی نہ پیدا ہوتے ہیں اور نہ ہی زوال پذیر ہوتے ہیں۔ زمین گول ہے اور کائنات کے مرکز میں ہے۔ چاند کے نیچے موجود تمام اجسام چار عناصر سے بنے ہیں۔ یہ عناصر مٹی، پانی، ہوا اور آگ ہیں لیکن فلکی اجسام ان عناص سے نہیں بنے بلکہ اُن کا مادہ مختلف ہے۔ اُسے پانچواں عنصر کہا جا سکتا ہے۔ زمینی اجسام کی قدرتی حرکت مستقیمی ہے یعنی وہ خطِ مستقیم میں محدود حرکت کرتے ہیں لیکن پانچویں عنصر سے بنے ہوئے اجسام یعنی فلکی اجسام دائرے میں حرکت کرتے ہیں۔ افلاک مکمل طور پر دائرے کی شکل میں ہیں۔ ستاروں کی حرکت اُس بے حرکت محرک کی وجہ سے ہے، جو

ستاروں کو مسلسل اور لامحدود رفتار سے چلاتا ہے۔۔۔ جہاں تک خلا کا تعلق ہے تو ارسطو اس بارے میں ڈیموکریٹس اور سپوسپس سے اختلاف کرتا ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ

''خلا۔۔۔''

زینو آہستہ آہستہ کلاس سے دُور جارہا تھا۔ راستے میں اُسے سپوسپس ملا جو ادارے کا ناظمِ اعلیٰ تھا۔ زینو نے شرارتاً کہا۔

''ارسطو کی عدم موجودگی سے اکیڈمی میں خلا ہے۔ اگرچہ ارسطو خلا کو نہیں مانتے ۔۔۔ہاہاہا۔۔۔ہاہاہا۔۔۔''

سپوسپس کچھ دیر خاموش رہا پھر ہنسی میں شریک ہوگیا۔ زینو سپوسپس کو ہنستا چھوڑ کر آگے چلتا گیا۔ فلکیات کے لیکچرر کی آواز اب ختم ہوچکی تھی۔ زینو ذرا آگے بڑھا تو برآمدے سے ایک مدھم آواز بلند ہونا شروع ہوئی۔ ذرا اور چلنے کے بعد اُس نے دیکھا کہ ایک جماعت جاری ہے جہاں سوفوکلیز کا ڈرامہ ''ایڈیسپس ریکس'' ڈرامائی انداز میں پڑھ کر سنایا جارہا تھا۔ لیکچر دینے والے کی آواز بھاری بھرکم تھی اور آواز کے زیر و بم نے تھیٹر کا سماں پیدا کر رکھا تھا۔

''نابینا پیغمبر تریسیاس نے کہا'' پہلے میری باتوں کو باطل ثابت کرو پھر بیشک مجھے نابینا کہو۔'' اس کے بعد کورس کا آغاز ہوتا ہے۔

''ڈلفی کی چٹان سے
آسمانی آواز مذمت کرتی ہے
خون بہانے والے کی
بے نام کارکردگی کرنے والے کی
کون ہے یہ شخص؟
اسے گھوڑے کو ایڑ لگانے دو

ہوا کو سموں سے لپٹنے دو

زیوس دیوتا کا بیٹا اُسے برباد کرنے کے لیے لپکتا ہے

جو شعلوں سے مسلح ہے

اور جس نے آسمانی بجلی پہن رکھی ہے

تو سن کر صبا باندھنے دو

تقدیر ثابت قدمی سے اُس کے گرد اپنا حلقہ باندھتی ہے۔۔۔حلق کستی ہے''

زینو کو سکندر یاد آیا، جو ڈلفی کی یاترا کے دوران دیوتاؤں سے قتل و غارت کی معافی مانگنے گیا تھا۔ زینو کلاس نے نکلا اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

''زینو۔۔۔!'' ایک نسوانی آواز اُس کی پشت سے ٹکرائی۔ زینو کے قدم رک گئے۔ اُس نے آنکھیں بند کر کے ایک لمبا سانس لیا۔

''میرا نام ایما ہے۔۔۔ایما زان ۔۔۔میں ماہرِ لسانیات ہوں۔'' آواز نے کہا۔

زینو نے آنکھیں بند کر کے ایک لمبا سانس لیا۔

''آپ کو سارا یونان جانتا ہے۔آپ جب جب اکیڈمی میں آئے، میری کلاس میں آنے سے پہلے ہی واپس چلے گئے۔ لسانیات کوئی بُری چیز تو نہیں۔''

''آؤ چلیں۔'' زینو بولا۔

''کیا مڑ کر نہیں دیکھیں گے؟'' آواز نے کہا۔

''آؤ چلیں۔'' زینو بولا۔

زینو اپنے نانا کے گھر میں رہتا تھا۔ جو اکیڈمی سے تقریباً سات سٹیڈیم کے فاصلے پر تھا۔ راستے میں ایما کا گھر تھا۔ باتیں کرتے کرتے دونوں پہلے ایما کے گھر گئے۔

''میں چاہتا ہوں کہ اکیڈمی ایک ماہرِ لسانیات سے محروم ہو جائے۔''

زینو نے ہنستے ہوئے ایما کے ماں باپ سے کہا۔ ماں مسکرائی، باپ نے چہرے پر مصنوعی تشویش طاری کرتے ہوئے کہا۔

''اس طرح اکیڈمی میں کلاسوں کا حرج ہو گا۔''

''شہر میں اور ماہرِ لسانیات بھی تو ہیں۔'' زینو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ جواباً تینوں ہنسے۔

کھانا کھانے کے دوران طرح طرح کی باتیں ہوئیں۔

''ایما تمہارے ساتھ کہاں جائے گی۔'' ماں نے پوچھا۔

''میں پہلے اُسے سمندر کی سیر پر لے جاؤں گا۔ مگر چھ سات ماہ بعد، اُس سے پہلے ہم ایتھنز ہی میں رہیں گے۔'' زینو بولا۔

''ایما اٹھارہ سال کی ہے۔ بس اسی شہر میں رہی ہے۔ ایک بار یہ اپنے باپ کے ساتھ میراتھان گئی تھی۔ اُس وقت یہ تیرہ سال کی تھی۔'' ماں نے بتایا۔

''اُس وقت بھی یہ اتنی ہی خوبصورت تھی؟'' زینو نے پوچھا۔

''اب ہے تو اُس وقت بھی تھی۔'' ماں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آج کل تم کیا کر رہے ہو۔'' باپ نے زینو سے پوچھا۔

''ایک کشتی بنوا رہا ہوں۔'' زینو نے بتایا۔

''ایما کے لیے؟'' ماں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

زینو نے کچھ سوچا اور جواباً مسکرایا۔

''اچھا تو ہم چلتے ہیں!'' ایما نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''پھر کب ملو گے؟'' باپ نے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

''روزانہ۔'' زینو بولا۔

''روزانہ، مگر چھ سات ماہ تک۔'' ماں بولتے ہوئے ہنسی۔

جب زینو ایما کے ساتھ اپنے نانا کے گھر پہنچا تو وہ پتھر سے خدوخال نکال رہا تھا۔ پاؤں کی چاپ سن کر اُس نے اپنی گردن موڑی۔ زینو کے ساتھ کھڑے ہوئے خوبصورت مجسمے کو دیکھ کر رنجیدہ ہوا۔ اُسے اپنی بیٹی یاد آئی۔ پھر مسکرا کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ رات کو جب بُت کدے میں چراغ جلایا گیا تو مجسموں کے سائے نکل آئے اور دیواروں پر لرزنے لگے۔

''ایفروڈائٹ اور ہیرا کے مجسموں کے درمیان یہ جو خالی جگہ ہے، یہاں میری ماں کا مجسمہ بن کر کھڑی ہوئی تھی۔۔۔ بہت سال پہلے۔۔۔ اور میرے باپ نے اُسے واقعی مجسمہ سمجھ لیا تھا۔ یہ جگہ اُس وقت سے خالی ہے۔'' زینو نے ایما کو بتایا۔

''کیا بہت خوبصورت تھی تمہاری ماں؟'' ایما نے زینو سے پوچھا۔

''ہاں تھی۔۔۔ تم اس خالی جگہ کو پُر کر دو۔'' زینو بولا۔

ایما مسکرائی اور دونوں مجسموں کے درمیان کھڑی ہوگئی۔ زینو کا نانا بت کدے میں داخل ہوا۔ زینو اور مصری مجسمہ ساز کچھ دیر تک نئے بت کو دیکھتے رہے۔ دونوں کی نظریں اپنی اپنی تھیں۔ مصری مجسمہ ساز واپس مڑا اور بھاری قدموں سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ زینو نے یونانی وائن کے دو جام بھرے۔ ہاتھ میں لیے، نئے بت کے پاس گیا اور مسکرایا۔

''اے ماہرِ لسانیات کے بت تجھے کتنی زبانیں یاد ہیں؟'' زینو کی سانس مجسمے کے ہونٹوں سے ٹکرائی۔ مجسمے کے مسکراتے ہوئے ہونٹوں نے زینو کے ہونٹوں پر خطِ تصویر کھینچا۔ زینو کو ہیروغلیفی طرزِ تحریر یاد آئی۔ جو مصری دستاویزات میں خطِ تصویر کی صورت میں لکھی جاتی تھی۔ اُسے اہرام مصر کی تصویری تحریریں یاد آئیں۔ جن کے نقوش اُس کے نانا کے پاس محفوظ تھے۔ دونوں دھیرے دھیرے مے کشی کرتے رہے اور ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، جب جام تمام ہوا تو زینو نے کہا۔

''تم کھڑے کھڑے تھک گئی ہو۔''

''کیسے پتہ چلا۔''ایما نے پوچھا۔

''دیوار پر تمہارے سائے کی لرزش بتاتی ہے۔''زینو نے مسکرا کر کہا۔

''میرے سائے میں تمہارا سایہ بھی ہے۔''ایما نے مسکرا کر کہا،۔

دونوں بستر پر بیٹھ گئے۔زینو نے پوچھا۔

''تمہارا نام ایما زان کیوں ہے۔ایما زان کا مطلب تو جنگجو عورت ہے۔تم تو بہت نازک ہو،تمہاری گفتگو کا لہجہ بہت نرم ہے اور تمہاری نظروں کا لمس ریشمی۔۔۔''

''کیا اس میں تمہاری موجودگی کا کوئی دخل نہیں؟''ایما نے سوال کیا اور پھر دونوں ہنسے۔

زینو نے ایما کے لوحِ جسم پر لمس کا خطِ میخی کھینچا اور میسو پوٹیمیا کی قدیم زبان میں کہا۔

''تمہاری آنکھیں سُرخ ہو رہی ہیں۔''

ایما نے قدیم فارسی میں پوچھا:

''کیا تمہیں ان کا رنگ نظر آتا ہے؟''

زینو نے سنسکرت میں جواب دیا۔

''ہاں۔۔۔!چراغ کی لو بتاتی ہے۔''ایما کچھ دیر خاموش رہی۔پھر زرتشی صحیفوں کی زبان اوستان میں بولی۔

''خمار آلود آنکھوں کی وجہ کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔۔۔!''

زینو بولا''میں یہ زبان نہیں جانتا۔''

ایما نے کہا''میں سکھا دوں گی۔''

۔۔۔پھر دونوں نے گفتگو پر خطِ تنسیخ کھینچا اور ابلاغ کی اُس دنیا میں داخل ہوئے

جہاں لفظ بے معنی اور آواز غیر ضروری ہو جاتی ہے۔

———————

ایک ماہ بعد زینو اور ایما ساحل پر پہنچے کشتی کی تعمیر جاری تھی۔ چالیس کاریگروں کا عملہ ماہر کشتی ساز کی سرکردگی میں مصروفِ عمل تھا۔ زینو کو دیکھ کر کشتی ساز مسکرایا اور بولا:

''کام جاری ہے۔''

''باقی سامان کا بندوبست ہو گیا؟'' زینو نے پوچھا۔

''ہاں! ایتھنز اور میراتھان میں کچھ لوگ میرے واقف ہیں، انھوں نے سامان پہنچانے کی حامی بھری ہے۔'' کشتی ساز نے بتایا۔

وہ دونوں ساحل کی ریت پر بیٹھ گئے۔ ایما بولی:

''افلاطون عورت اور مرد کی ذہنی قابلیتوں کی مساوی سطح کو دیکھتا تھا۔ یوٹوپیا میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ وہ عورت اور مرد کو برابر تعلیم دلانے کا حامی تھا۔ مگر اب سوچ بدلتی جا رہی ہے ارسطو مرد کو عورت پر فضیلت دیتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔۔۔؟'' زینو مسکرایا اور بولا:

''ارسطو سے پوچھیں گے اگر ملاقات ہوئی تو۔''

ایما نے پوچھا ''تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔؟''

''میرے خیال میں جنس کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں۔ افلاطون ٹھیک کہتا ہے۔ افلاطون تو یہ بھی کہتا تھا کہ بچوں کو ہومر اور ہیسیڈ کی شاعری نہیں پڑھانی چاہیے، کیونکہ یہ برانگیختہ کرتے ہیں۔ دیوتاؤں کے فلک شگاف قہقہوں سے دہلاتے ہیں۔ قتل و غارت کے اندوہناک مناظر دکھاتے ہیں جس کی وجہ سے بچوں کے ذہنوں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔'' زینو بولا۔

''افلاطون ٹھیک کہتا ہے۔'' ایما نے کہا۔

''مگر ارسطو نے سکندر کو ہومر پڑھایا۔'' زینو نے تشویش سے کہا۔

''سکندر بچہ ہے۔ اُس کی ذہنی کمسنی کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ ہومر اُس کے اعصاب پر چھا گیا۔'' زینو بولا۔

''اس میں اور عوامل کا عمل دخل بھی ہے۔ صرف ہومر اور ارسطو قصوروار نہیں۔'' ایما نے کہا۔

''اور عوامل تھے مگر چنگاری تھے جس پر ہومر کے مصرعوں کی خشک لکڑیاں ترتیب سے رکھی گئیں اور پھر پھونک لگائی گئی۔'' زینو بولا۔

''تم نے الاؤ پر پانی کیوں نہیں پھینکا؟'' ایما نے پوچھا۔

''پھینکا تھا۔'' زینو بولا۔

''پھر۔۔۔؟'' ایما نے پوچھا۔

''اس وقت تک الاؤ قریبی درختوں کے تنوں کو پکڑ چکا تھا۔ جب میں نے پانی پھینکا تو درخت ایک دوسرے پر آگ کے گولے پھینک رہے تھے۔'' زینو بولا۔

''مگر تم تو زینو ہو سکندر تمہارے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔'' ایما نے اعتماد سے کہا۔

''آگ جب پاگل ہو تو بے قابو ہو جاتی ہے۔'' زینو بولا۔

''جب ارسطو سکندر کو تعلیم دے رہا تھا تو تمہارا فرض تھا کہ تعلیم کی درستی کا یقین کرتے۔'' ایما نے کہا۔

''مجھے ارسطو پر اعتماد تھا۔ میرے خیال میں ارسطو کے پائے کا عالم صرف اور صرف مناسب ترین تعلیم دے سکتا ہے اور بس۔'' زینو نے کہا۔

''مگر ارسطو شاید مجبور تھا۔ وہ فلپ دوم کی حکم عدولی نہیں کرسکتا تھا۔ اُس نے سکندر کی سوچ کو اُس طرح تراشا جیسا کہ اُس سے توقع کی جاسکتی تھی۔'' ایما نے کہا۔

''مجھے اب بھی خیال آتا ہے کہ چار سال کی تعلیم کے دوران ارسطو نے یقیناً بہت سی ایسی مثبت باتیں بھی سکندر کو بتائی ہوں گی جو زندگی کے مختلف مراحل پر اُس کی سوچ پر اثر

انداز ہوسکتی ہیں مگر فی الحال آگ پھیل رہی ہے اور جنگل نے شعلے پہن لیے ہیں۔'' زینو بولا۔

چھ ماہ گزر گئے ان دونوں کا زیادہ وقت ایما کے ہاں یا زینو کے نانا کے گھر گزرا۔ کبھی کبھی اکیڈمی کی گہما گہمی میں گفتگو کے سلسلے چلے۔ ہر ماہ ساحل سمندر کا مختصر دورہ رہا۔ جب زینو اپنے نانا سے رخصت ہو رہا تھا تو نانا کے اندر چھپا ہوا مصری مجسمہ ساز ایما کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''زینو! یہ مجسمہ بھی ساتھ لے جا رہے ہو۔۔۔ یہ مجھے دے دو۔''

''یہ مجسمہ نہیں ہے۔'' زینو بولا۔

''ہے۔'' مجسمہ ساز ایما کا بازو پکڑ کر بولا۔

''نہیں ملے گا۔'' زینو نے ایما کا ہاتھ چھڑایا۔ تینوں ہنسے۔ مصری مجسمہ ساز نے الوداعی ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔ پھر دونوں ایما کے ہاں گئے۔ ایما کو اس کی ماں ایک طرف لے گئی اور تشویش کے انداز میں کہا۔

''ایما! تمہاری زینوے کے ساتھ رفاقت کو چھ ماہ گئے مگر تم ابھی تک امید سے نہیں۔ تمہیں تو یہاں کے رسم و رواج کا علم ہے۔ اگرچہ ایتھنز روشن خیال علاقہ ہے مگر یہاں بھی مقدونیہ کی طرح اُن عورتوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے جو بچہ پیدا نہ کرسکیں۔ کیا زینو نے اس بارے میں کچھ کہا ہے؟''

''نہیں۔'' ایما نے کہا۔

''مجھے اس بات کی فکر ہے۔'' ماں کے چہرے پر تشویش دوچند ہوئی۔

''ہمیں نہیں ہے۔'' ایما نے کہا۔

چلتے وقت ایما کے باپ نے پوچھا۔

''پھر کب ملو گے؟''

''معلوم نہیں۔'' زینو بولا۔

''ایسی کون سی بات ہے جس کا زینو کو علم نہیں؟'' ماں نے پوچھا۔

''بہت سی باتیں ہیں۔'' زینو نے کہا اور دونوں رخصت ہوئے۔

پچیس گھوڑا گاڑیاں ساحل کی طرف روانہ ہوئیں۔ان گاڑیوں میں بڑے بڑے صندوق اور سامان تھا جو زیادہ تر اشیائے خورونوش پر مشتمل تھا۔زینو اور ایما ایک گاڑی میں تھے جو بڑی تھی اور جسے دو گھوڑے کھینچتے تھے۔ساحل ابھی کچھ دور تھا،مگر بلندو بالا کشتی صاف دکھائی دیتی تھی،گھوڑا گاڑیاں ساحل پر رُکیں۔سامان لادا گیا۔کشتی ساز فخر یہ انداز میں کشتی میں ہر طرف چل رہا تھا۔کبھی مستول پر ہتھیلی کا وار کر کے اس کا تناؤ محسوس کرتا تو کبھی آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر بادبانوں کی بلندی دیکھتا۔

''کشتی پسند آئی؟'' کشتی ساز نے پوچھا۔

''بہت ۔۔۔اگر تم اُتر جاؤ تو زیادہ پسند آئے گی۔'' زینو نے ہنستے ہوئے کہا۔کشتی ساز ہنستے ہوئے واپس مڑا اور سیڑھی کے ذریعے نیچے اُتر گیا۔

کشتی بحیرۂ آژ کے نیلے پانی میں رواں ہوئی اور جزیرہ ایجز کی طرف چلنے لگی ۔زینو کشتی چلا رہا تھا اور ساتھ ساتھ ایما کو کشتی رانی کے اسرار و رموز بھی سمجھا رہا تھا۔

''اس جزیرے کا نام کیا ہے؟'' ایما نے پوچھا۔

''ایما۔'' زینو بولا۔

''ہاں۔۔۔؟'' ایما نے چونک کر جواب دیا۔

''اس جزیرے کا نام ایما ہے۔'' زینو نے ہنس کر کہا۔

ایما ہنسی تو زینو نے کہا:

''خوبصورت جزیرہ ہے سو نام بھی خوبصورت ہے۔''

جب کشتی جزیرے کے نواحی پانی پر پھسل کر ڈولنے لگی تو ایما چونکی۔عرشے پر کھڑے ہوکر اُس نے پانی کو دیکھا جو سرمئی تھا اور اُس میں گردابوں کے سیاہ روزن گھومتے تھے۔وہ لڑکھڑاتی ہوئی واپس آئی کیونکہ کشتی ڈول رہی تھی اور زینو کے ساتھ چمٹ کر بولی:

''مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''تمہارا نام ایما زان ہے۔پھر بھی ڈرتی ہو؟ کچھ نہیں ہوگا۔۔۔کچھ نہیں ہوگا''

زینو بولا۔

کشتی ساحل کے قریب رُکی ۔لنگر گرائے گئے ۔سیڑھی لگائی گئی۔چند چھوٹی کشتیاں بڑی کشتی کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں اور پانی پر تیرتی تھیں ۔زینو نے ایک کشتی کھولی۔دونوں اس میں بیٹھے اور چپو چلاتے ہوئے ساحل پر آ گئے ۔چھوٹی کشتی کو کھینچ کر ساحل پر لایا گیا اور زیوس کے مجسمے کے قریب ایک درخت سے باندھ دیا گیا۔

دونوں نے پگڈنڈی پر چلنا شروع کیا۔زینو چھ سال کے بعد جزیرے میں آیا تھا جھیل کے پار اسے گھر نظر آیا۔دُور سے گھر میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی تھی ۔کیونکہ اس وقت یہ گھر بہت مضبوطی سے بنایا گیا تھا۔البتہ گھر کی رنگت سیاہ ہوگئی تھی اور اس کا ابتدائی گہرا خاکی رنگ اُتر گیا تھا۔زینو ایک درخت کے پاس رُکا۔تنے کے گرد ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں ۔اُس نے ایک ران کی ہڈی کو اٹھا کر دیکھا اور بولا۔

''یہ میری ماں کی ہڈی ہے۔''

پھر زینو نے ایک اور ران کی ہڈی اٹھائی اور بولا۔

''یہ میری ماں کی نہیں ہے۔''

''تمہارے باپ کی ہے؟''ایما نے پوچھا۔

زینو نے ہڈی پھینکی اور گھر کی طرف چلتے ہوئے کہا۔

''نہیں اُس کی بھی نہیں ہے۔''

جب وہ گھر کے قریب پہنچا تو بہت سے جانور گھر سے باہر نکلے اور بھاگتے ہوئے درختوں میں غائب ہوگئے۔ زینو گھر میں داخل ہونے سے پہلے رُک گیا۔ چھوٹے بڑے سانپوں کا ایک گروہ دروازے سے باہر نکلا اور تیزی سے رینگتا ہوا دُور نکل گیا۔ دونوں گھر میں داخل ہوئے زینو کا کمرہ زیادہ تبدیل نہیں ہوا تھا۔ اُس کے والدین کا کمرہ خستہ حالت میں تھا۔ لکڑی کے صندوق ٹوٹ گئے تھے۔ سونے کی چھوٹی بڑی ڈلیاں ڈھیروں کی صورت پڑی تھیں، جن پر سالہا سال جانوروں نے اُودھم مچایا تھا۔ ایک کونے میں ٹوٹی ہوئی ہڈی کی چھلتریں پڑی تھیں۔ زینو نے ایک چھلترا اٹھا کر کہا۔

''یہ میرے باپ کی ہڈی کا ٹکڑا ہے۔''

''گھر صاف کرنے میں کچھ دن لگیں گے۔'' ایما نے کہا۔

''کچھ دن ہم کشتی میں رہیں گے۔'' زینو بولا۔

ایک ماہ گزر گیا۔ زیتون کے درخت کے پاس آ کر زینو رکا۔ ایما اُس کے ساتھ تھی۔ زینو کی کمر میں ترکش تھا۔ تیروں کی نوکیں سونے کی تھیں۔ ایما کی دونوں کلائیوں میں سونے کا ایک ایک کڑا تھا۔ زینو نے ایک چھوٹا تیر ترکش سے نکالا اور اُسے کمان میں بھرا۔ زیتون کے درخت میں ریشمی سرسراہٹ ہوئی۔ سورج موسم بہار کی سہ پہر میں تھا۔ زینو نے لرزتے ہوئے سورج کا نشانہ لیا۔ اُس نے تیر کو ڈورے پر کستے ہوئے زیتوں کی سرسراہٹ کو دوبارہ سنا۔ درخت تیار تھا۔ کمان کی تشنج بھری انگڑائی پوری توانائی کے ساتھ چھک کی آواز دیتی ہوئی تیر کے ساتھ لپٹ کر اُڑی۔ درخت نے اپنی کمان سے کوہی ابابیل کا تیر چھوڑا۔ کچھ دیر کے بعد ابابیل تیر اپنے پنجوں میں لیے واپس زینو کے ہاتھ پر اُتری۔

''کمان سے نکلا ہوا تیر واپس آ سکتا ہے؟'' ایما نے پوچھا۔

''ہاں! کوہی ابابیلوں سے دوستی شرط ہے۔'' زینو بولا۔

اس ایک ماہ کے دوران زینو کا دستور تھا کہ وہ ایما کے ساتھ دن بھر جزیرہ نوردی

کرتا۔ جگہ جگہ رُکتا کدال سے زمین کھودتا، معمولی گہرائی پر سونے کی ڈلیاں ملتیں۔ وہ سونے کو بوری میں بھرتا اس دوران طرح طرح کی باتیں ہوتیں۔ ایما اسے سیفو کی غنائی شاعری سناتی تھی۔ دنیا کی مختلف زبانیں بولی جاتیں۔ کبھی دونوں جھیل کے نیلے پانی میں نہاتے، کبھی سمندر کے نمکین پانی میں۔ زینو ایما کو سمندر میں گہرا غوتا لگانا سکھاتا۔ اب سمندر کی مچھلیاں ایما کی بھی عادی ہوتی جارہی تھیں۔ کبھی کبھی دونوں بڑی کشتی میں بیٹھ کر کھلے سمندر میں نکل جاتے کبھی چھوٹی کشتی میں جزیرے کے قریب گھومتے۔ سونا چھوٹی چھوٹی بوریوں میں بھر کر ساحل پر لایا جاتا، جسے چھوٹی کشتی میں ڈال کر بڑی کشتی تک لے جایا جاتا اور پھر صندوقوں میں بھر دیا جاتا، اسی طرح پانچ ماہ گزر گئے۔ ایک دن دونوں بڑی کشتی میں سوار ہوئے، زینو نے ایک لمبا سانس لیا اور بولا۔

''سونا جب بہتات میں ہو تو اس کی ایک مخصوص بو ہوتی ہے۔''

بادبان کسے گئے، لنگر اٹھائے گئے۔ کشتی کا رخ ایتھنز کی طرف تھا، جب کشتی ریاست ایٹیکا کے قریب پہنچی تو زینو چھوٹی کشتی پر ساحل کی طرف روانہ ہوا۔ کشتی ساز نے استقبال کیا اور چند آدمیوں کے ساتھ ایک اور کشتی میں سوار ہو کر زینو کے ساتھ ساتھ بڑی کشتی تک پہنچا۔ رسیوں کی مدد سے ایک صندوق اُتارا گیا۔ جسے کشتی ساز نے ہنستے ہنستے اپنی کشتی میں رکھا اور واپس ساحل کی طرف روانہ ہوا۔ زینو اور ایما نے کچھ دیر یونان کی مٹی کو دور سے دیکھا جو دوپہر کی چمکتی دھوپ میں لرز رہی تھی۔ بڑی کشتی کے بادبانوں کا رُخ متعین کیا گیا اور ہوا نے کشتی کو بحیرۂ آژ کے گہرے نیل کی طرف دھکیلنا شروع کیا۔

میدانِ جنگ میں شکوہِ دارائی اور شانِ سکندری کی آزمائش تھی۔ اس کے قریب دریائے پنارس کے کنارے دارا کی فوج صف آرا تھی۔ گھوڑوں کے جوڑے دارائی رتھ کھینچتے تھے۔ ہر رتھ کے پہیئے مسلح تھے۔ ان کے مرکزوں سے دوشاخہ اور سہ شاخہ دشنے

پھوٹتے تھے۔ پہیوں کے بیرونی دائروں ،اندرونی گھیروں اور گگروں میں دشنے برابر گڑے ہوئے تھے۔ جب پہیئے گھومتے تو اُن کے ساتھ دشنوں کی چمک گھوم کر دائرہ کرتی اور ذرا فاصلوں پر پہیوں کی نگہ داری کرتی تھی۔ مرصع رتھوں کے پیچھے قطار اندر قطار گھوڑے تھے۔شہ سوار بالا بلند نیزوں سے مسلح تھے۔ چمکیلے خود سروں کے محافظ تھے۔ گھنگریالی داڑھیاں ہوا میں جھولتی تھیں۔ دارا جس رتھ پر سوار تھا اُس پر سیم وزر کے ستون سائبان کو سہارا دیے ہوئے تھے۔ پیادہ دستے عقب میں تھے۔

دارا کا رتھ سب سے آگے تھا۔ دارا رتھ سے اُترا تو ڈھلتے ہوئے سورج میں اُس کا چمکیلا ملبوس جھلملایا اور اُس کی انگوٹھی کے نگینے نے روشنی پھینکی۔ دارا کے پاؤں کی وریدیں پھولی ہوئی تھیں۔ اُس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ دریا کے پار ایک ہیولا پھڑ پھڑانے لگا۔ دارا نے ہاتھ کا چھجا بنا کر آنکھوں کے اُوپر رکھا اور پپوٹے سکیڑ کر ہیولا دیکھنے لگا۔فوج نے جھرجھری لی تو آہنی کھنک پہلے جھنکار میں بدلی اور پھر خاموش ہوگئی۔ ہیولا بڑھتا جارہا تھا جو بالا آخر ایک گھڑ سوار کی شکل میں واضح ہوا۔ دارا نے ہاتھ بلند کر کے فوج کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ گھڑ سوار شاید دریا سے واقف تھا۔ اُس نے دریا میں اُس جگہ گھوڑا دوڑایا جہاں پانی اتھلا تھا۔ حیرت سے دارا کا ہاتھ ابروؤں سے گر کر زرہ بکتر سے ٹکرایا تو انگوٹھی نے آواز دی۔ گھڑ سوار دارا کے عین سامنے آکر رُکا۔ وہ غیر مسلح تھا۔ دارا گھبرا کر رتھ میں بیٹھ گیا۔ زینو گھوڑے سے اُترا اور دارا کو رتھ سے اُترنے کا اشارہ کیا۔ دارا بے ساختہ رتھ سے اُترا اور زینو کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''تیاری مکمل ہے؟'' زینو نے پوچھا۔

''ہاں۔'' دارا کے جواب میں آواز کم اور سانس کا اخراج زیادہ تھا۔

''مرنے کی یا مارنے کی؟'' زینو نے پوچھا۔

''ہاں! مرنے کی یا مارنے کی۔'' اس بار دارا نے بہتر جواب دیا۔

''زیادہ توقع کیا ہے؟'' زینو نے پوچھا۔

''مارنے کی۔'' دارا نے کہا۔

''تم تو جہاں دیدہ اور عمر رسیدہ شخص لگتے ہو!'' زینو بولا۔

''تو۔۔۔؟'' دارا نے حیرت سے پوچھا۔

''تو بچے سے لڑتے ہو۔۔۔؟ سکندر بگڑا ہوا بچہ ہے۔'' زینو بولا۔

''یونان کی تاریخ لڑکپن میں نہیں ہے۔ دارئی سلطنت اور سکندری یونان کی لڑائی بہت پرانی ہے۔ بس اب کے انداز نیا ہے۔'' دارا اب سنبھل چکا تھا۔

''انفرادی اناؤں کی جنگ میں اجتماعی معصومیت قتل ہوتی ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔'' زینو بولا۔

''تم کون ہو۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی میرے اندر سے نکل کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا ہے۔'' دارا نے پوچھا۔

''میں زینو ہوں۔''

''میں بہت صاف گو انسان ہوں۔ آتش پرست ہوں۔ تمہاری آنکھوں کی حدت مجھے پگھلاتی ہے۔'' دارا نے کہا۔

''صاف گو ہوتے تو کیا بادشاہ ہوتے۔۔۔ اور وہ بھی اتنی بڑی سلطنت کے!''

زینو بولا۔

''تم کہاں سے ہو؟'' دارا نے پوچھا۔

زینو نے اپنے پاؤں کے نیچے زمین کو دیکھا اور کہا۔

''یہاں سے ہوں۔''

''مگر تمہارے خال وخد یہاں کے نہیں ہیں۔'' دارا نے کہا۔

''جنگ میں کوئی نہیں جیتتا۔ بس ایک تماشا ہے جو جیتتا ہے۔'' زینو بولا۔

''تو یہ تماشا ہو کر رہے گا۔'' دارا نے کہا۔

''اور جیتے گا۔'' زینو بولا۔ دارا چپ رہا۔

''اگر تم جیت جاؤ گے تو کیا کرو گے؟'' زینو نے پوچھا۔

''یونان کو اپنی سلطنت میں شامل کروں گا۔'' دارا نے کہا۔

''اس کے بعد کیا کرو گے۔ یونان کے آگے سمندر ہے۔'' زینو بولا، دار چپ رہا۔

''اور اگر تم ہار جاؤ گے تو سکندر کیا کرے گا۔ کیونکہ تمہاری سلطنت کے آگے بھی زمین ہے۔ سکندری سیلاب کتنی زمین پر پھیل سکے گا۔ اگر ساری زمین پر بھی پھیل گیا تو آگے سمندر ہے۔۔۔ اور پیچھے بھی۔''

''تم سکندر کی طرفداری کر رہے ہو۔'' دارا نے کہا۔

میرے ترازو میں سکندر اور تم برابر ہو۔ سکندر کے سر میں جنون ہے۔ تمہارے سر میں سودا ہے۔ تم گڈریے ہو اور یہ۔۔۔ یہ فوج۔۔۔ یہ تمہارا ریوڑ ہے۔'' دارا چپ رہا۔

''ریوڑ پالنے کے لیے کتنا چارہ ہے تمہارے پاس؟'' زینو نے پوچھا۔

''بہت ہے، بہت زیادہ ہے، سکندر سے کہیں زیادہ، میں ایک امیر بادشاہ ہوں اور سکندر لٹیرا ہے۔'' دارا نے بلند آواز میں کہا۔

''اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ بحیرہ روم میں ایک بہت بڑی کشتی کھڑی ہے جس میں سینکڑوں بڑے بڑے صندوق خالص سونے سے بھرے ہوئے ہیں اور کشتی یہاں سے چند گھنٹوں کے فاصلے پر ہے۔۔۔ تو کیا تم یقین کرو گے؟'' زینو نے پوچھا۔

دارا نے زینو کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا:

''تم کہتے ہو تو یقین کرتا ہوں۔''

''اور اگر میں یہ کہوں کہ سونا خالصتاً خالص ہے۔ اُس میں ملاوٹ کا شائبہ تک

نہیں۔سوائے اُس ہوا اور روشنی کے جو چمکتی ڈلیوں کو مس کرتی ہے۔۔۔تو کیا تم یقین کرو گے؟'' زینو نے پوچھا۔

''ہاں!'' دارا نے کہا۔

''میں وہ سونا تمہیں دینا چاہتا ہوں۔اس شرط پر کہ تم سکندر سے صلح کی کوشش کرو۔'' زینو نے کہا۔

''یہ ممکن نہیں اس کی دو وجوہات ہیں۔ایک یہ کہ مجھے دولت کی کمی نہیں، دوسرا یہ کہ سکندر میرے علاقے میں گھس کر میری سلطنت کو تاراج کر رہا ہے۔اس موقع پر پیچھے ہٹنا اپنی انا کو قتل کرنے کے مترادف ہوگا۔'' دارا نے کہا۔

''انفرادی اناؤں کی جنگ میں اجتماعی معصومیت قتل ہوتی ہے۔کیا مانتے ہو؟'' زینو نے پوچھا۔

''ہاں۔'' دارا نے سرگوشی میں کہا۔

''حکومت کرنے سے کیا ہوتا ہے۔۔۔کیا ملتا ہے؟'' زینو نے پوچھا تو جواب میں دارا نے شاہانہ مسکراہٹ دی اور کہا:

''چہرہ اس طرح مسکراتا ہے۔'' دارا نے مسکراتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''اب تک کیے گئے سوالوں میں تمہارا یہ سوال کمزور ترین تھا۔انسانی تہذیب و تمدن اگر ایک حقیقت ہے تو حکومت کرنا ایک لازمی امر ہے۔۔۔تم نے یہ کیا سوال کیا؟''

''اگر تم سوالوں کی صحت کا جائزہ لے رہے ہو تو میرا سوال قائم ہے۔اس موضوع پر بات ہوسکتی ہے۔اگر تم زندہ رہے تو۔۔۔!'' زینو بولا۔

''تم سکندر کی طرفداری کر رہے ہو۔'' دارا نے کہا۔

''سکندر کہتا ہے کہ میں دارا کی طرفداری کرتا ہوں۔'' زینو بولا۔

''تم میرا یقین متزلزل کر رہے ہو اور وہ بھی اس نازک موقع پر جب تاریخ

کا اہم ترین باب لکھا جا رہا ہے۔'' دارا نے کہا۔

''تاریخ لکھنے والے بھی تمہارے جیسے بادشاہ ہوتے ہیں۔ وہ واقعات اور لفظوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ میرے نزدیک تم اور سکندر دونوں ذہنی مریض ہو۔ جیسا کہ تم دونوں کے آباؤ اجداد تھے۔'' زینو بولا۔ دارا چپ رہا۔

''رات نیند آئی تھی؟'' زینو نے پوچھا۔

''ہاں۔'' دارا نے کہا۔

''گزشتہ رات سے پہلی دو راتیں سوئے تھے؟'' زینو نے پوچھا۔

''نہیں۔'' دارا نے کہا۔

''کشتی سمندر میں کھڑی ہوئی ہے۔ میری پیشکش قائم ہے۔ جنگ کا انجام کیا ہوتا ہے تم جانتے ہو۔ سکندر تمہارے مقابلے میں غریب ہے۔ اگر وہ جیتے گا تو امیر ہو جائے گا۔ کشور کشائی اور مالِ غنیمت دونوں سے استفادہ کرے گا۔ اگر تم جیتو گے تو غریب ہو جاؤ گے کیونکہ یونان پر قبضہ کرنے کے بعد تمہیں وہاں کی ریاستیں پالنا پڑیں گی۔ سکندر کو یہاں پہنچے میں ابھی ایک پہر لگے گا، سوچ لو، اگرچہ تم بھی سکندر کی طرح عقل سے تقریباً عاری ہو۔ مگر عمر رسیدہ ہو۔ سکندر سے بہتر سوچ سکتے ہو۔ اپنے بچے کھچے ذہن کو کام میں لاؤ۔ کشتی سمندر میں کھڑی ہوئی ہے میری پیشکش قائم ہے۔ پیشکش کی معیاد ایک پہر ہے۔'' زینو نے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے کہا۔

سکندر کا لشکر قیامت خیز سیلاب کی طرح بہتا چلا آ رہا تھا۔ سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والے لشکریوں کے سر پر خون سوار تھا اور چمکتی خودیں اس خون کے اوپر جمی ہوئی تھیں۔ جن کی چھتوں پر ریشوں اور پروں کی رنگیں کلغیاں تھیں۔ بعض کی آہنی شاخیں کانوں سے نیچے جبڑوں تک اُتری ہوئی تھیں۔ جن پر لگے ہوئے فولادی پٹ چہروں پر پھاٹک

لگاتے تھے۔زرہ بکتروں پر نقش نگاری تھی۔جانوروں کی شبیہیں تھیں۔کئی زرہ بکتریں جھنجھناتی تھیں، جب اُن پر لگے ہوئے سکے آپس میں ٹکراتے تھے۔اپنے باپ کی طرح سکندر بھی فوج کو فیلنکس کی شکل میں صف آراء کرنا خوب جانتا تھا۔فوج کا پیدل دستہ سولہ قطاروں کی صفیں لگا تا شانوں سے شانے اور زرہ بکتر سے زرہ بکتر جوڑ کر پہلی صف کے نیزے اُفقی سمت میں جسموں کے نصف پر قائمہ زاویہ بناتے تھے۔پچھلی صفوں کے نیزے لمبائی میں بڑھتے جاتے تھے۔چھٹی صف کے نیزے مزید لمبے تھے۔جن کی انیاں پہلی صف کے نیزوں کے برابر آتیں۔اس طرح چھ صفیں بیک وقت حملہ آور ہوتی تھیں۔سکندری فوج کے کئی رنگ تھے۔باقاعدہ سپاہیوں کے علاوہ اس میں مساحت کنندگان تھے۔انجینئر تھے، ماہر تعمیرات تھے،سائنس دان،درباری،تاریخ دان اور ستارہ شناس تھے۔ہر معرکے سے پہلے سکندر گھوڑے کی لگام کو مٹھی میں نچوڑتا تو گھوڑا پچھلے پاؤں پر کھڑا ہو کر انسان بننے کی کوشش کرتا۔

جب سکندر ٹرائے پہنچا تو اسے ہومر شدت سے یاد آیا۔اُسے ٹرائے کی مٹی پر اکلیس کے نقشِ پا نظر آ رہے تھے۔جس میں بائیں ایڑی کا نشان باقی کفِ پا سے مختلف بھی تھا اور نہیں بھی۔اُسے زینو بھی شدت سے یاد آیا۔ایک بار اُس نے زینو سے کہا تھا کہ اکلیس کے بعد وہ ٹرائے پر لشکر کشی کرے گا اور اتنی شان وشوکت سے کہ لوگ ہومر کی شاعری بھول جائیں گے۔اُس نے زینو سے کہا تھا کہ وہ اُس ہوا میں سانس لے گا جس میں ہیلن کی خوشبو ہے۔اُس نے شرارتاً زینو سے پوچھا تھا:

''ہیلن کی خوشبو کیسی ہے؟''

''ہومر جیسی ہے؟'' زینو نے جواب دیا تھا۔

''ہومر کی خوشبو کیسی ہے؟''

''لفظوں جیسی ہے۔!!!''

''اور لفظوں کی خوشبو؟''

''معانی جیسی۔۔۔!!!''

''اور معانی کی؟''

''بات ہیلن سے شروع ہوئی تھی اور کہاں سے کہاں نکل گئی۔ٹرائے کی جنگ بھی ہیلن کی شخصیت سے بہت آگے نکل گئی تھی۔'' زینو نے کہا تھا۔

لشکر بڑھتا رہا۔معرکے کرتا رہا۔تمام رنگوں پر حاوی خون کا رنگ تھا۔پھر خون کے بہت سے رنگ تھے۔تازہ چمکتا ہوا، نیم ٹھوس گہنا تا ہوا، سیاہی مائل جمتا ہوا، سیاہ جھڑتا ہوا، قرمزی سمٹا ہوااور گلابی پھیلا ہوا۔جب کھڑے پانی پر تازہ خون گرتا تو گلابی ہوتا۔ جب خون کی ٹھہری ہوئی گلابی پر گھوڑے کے سم پڑتے تو اتھلے پانی کی تہہ میں بیٹھی ہوئی مٹی ابلتی اور رنگ کھا جاتی۔ پھر خون کی بہت سی باسیں تھیں۔شام کو سب سے زیادہ چبھنے والی خون کی باس تھی۔جب وہ کچلے ہوئے گھاس میں جذب ہو جاتی تھی جسے گھوڑوں کے سم روندتے تھےاور ہوا پھیلاتی تھی۔

ایشیائے کوچک کے علاقے فریجیا میں سکندر کو ایک گانٹھ دکھائی گئی جسے فریجیائی گرہ کہا جاتا تھا۔یہ گانٹھ بیک وقت ایک فربہ اور باریک ریشے سے بنی ہوئی تھی۔مشہور تھا کہ یہ گانٹھ صرف وہ شخص کھول سکتا ہے جولاثانی ہوگا۔جب سکندر نے اس کو تلوار کے وار سے کھولا تو اُسے زینو یاد آیا تھا۔زینو نے ایک بار کہا تھا:

''زندگی جب تک اَن چھوئی تھی تو ہوا میں جھولتی ہوئی ریشم کی ڈوری کی طرح نرم اور سیدھی تھی۔اسے چھو لیا گیا تو فریجیائی گرہ بن گئی۔ بیتاب پوروں نے گرہ کے پیچ اور بل الٹی طرف کھینچے تو مضبوط ہوتی چلی گئی۔۔۔اور اب کھلتی نہیں۔۔۔

سکندر! بعض اوقات گرہوں کو کچھ دیر تک نہ چھوا جائے تو دھاگے کے بل نرم پڑ جاتے ہیں۔گانٹھیں خود بخود ڈھیلی ہو جاتی ہیں۔خود بخود کھل جاتی ہیں۔''

ایک پہر گزر گیا۔ دارا اور سکندر نے ایک دوسرے کو پہلی بار آمنے سامنے دیکھا۔ دونوں فوجوں کی فصلیں کھڑی تھیں۔ جن میں نیزے سرکنڈوں کی طرح اُگے ہوئے تھے۔ پھر وہی ہوا جو جنگوں میں ہوتا ہے۔ ہوا میں دو فوجیں برسرِ پیکار تھیں مگر زمین پر گرنے والے خون سے حسبِ ونسب اور رنگ ونسل کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ دارا ہارا، بابل کی طرف بھاگا۔ سکندر جیتا۔ مالِ غنیمت میں سب سے زیادہ قیمتی دارا کی تجوری تھی۔ جو زر و جواہر سے بھری ہوئی تھی۔ دمشق بھی ثروت میں ڈوبا ہوا تھا۔ سکندر جب یونان سے چلا تو پانچ سو ٹیلنٹ کا مقروض تھا۔ مگر اب جگہ جگہ دولت اُس کی منتظر تھی۔

زینو نے دیکھا کہ دریائے نیل بحیرۂ روم میں گر رہا ہے۔ اُس نے کشتی کا رُخ مشرق کی طرف کیا۔ مصر کے ساحل سے ذرا دور لنگر گرائے گئے۔ زینو اور ایما چھوٹی کشتی پر بیٹھ کر مصر کی زمین پر اُترے۔ موسم گرما اختتام پذیر تھا۔ راتیں ٹھنڈی تھیں اور دن معتدل۔ دونوں جس بستی میں جاتے وہاں مردنی چھائی ہوتی۔ سکندر کسی بھی لمحہ وارد ہوسکتا تھا۔ باقاعدہ جنگ کا امکان تھا۔ کیونکہ مصر ذہنی طور پر سپردگی کے لیے تیار تھا۔ ایک بستی سے باہر نکلتے ہوئے زینو نے گھوڑا روکا۔ ایما نے بھی اپنے گھوڑے کو لگام دی۔ زینو اُترا اور ایک شخص کے پاس گیا۔ وہ شخص چونکا دینے والے خال وخد کا تھا۔ اُس کے سیاہی مائل گندمی چہرے پر اُبھری ہوئی چمکدار آنکھیں تھیں۔ جن میں شام کا سورج لرز رہا تھا۔ اُس شخص نے زینو کو غور سے دیکھا اور مسکرایا۔

''بحیرہ روم اور بحرِ ہند کے درمیان خشکی کا یہ ٹکڑا زیادہ طویل نہیں ہے۔'' زینو بولا۔

''ہاں۔ گھوڑے پر دو دن لگتے ہیں۔ ایک سمندر سے دوسرے تک۔'' مصری نے بھاری آواز میں بتایا۔

''ہماری کشتی بحیرہ روم میں ہے اور ہم بحیرہ احمر میں جانا چاہتے ہیں۔'' زینو

بولا۔مصری خاموش رہا۔

''کشتی کو بھی لے جانا چاہتے ہیں۔'' زینو بولا۔

''کشتی بہت بڑی ہے۔'' ایمانے کہا۔ جو گھوڑے سے اُتر کران دونوں کے پاس آ گئی تھی۔مصری بہت دیر تک زینو کو دیکھتا رہا۔بغیر آنکھیں جھپکائے اُس کے گھنے ابرو کبھی کبھی تھر کتے تھے۔

''کشتی جتنی بھی بڑی ہو اہرامِ مصر سے بڑی نہیں ہوگی۔۔۔کشتی دوسرے سمندر میں جائے گی۔'' مصری بااعتماد آواز میں بولا۔بات کرتے ہوئے وہ مسلسل زینو کو دیکھتا رہا۔

''میرے گھر چلو۔'' مصری نے کہا۔زینو نے اپنا گھوڑا مصری کو دیا اور خود ایما کے ساتھ سوار ہو گیا۔

پرانا مگر مضبوط گھر تھا۔ جب تینوں گھر میں داخل ہوئے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ مصری نے چراغ جلایا۔زینو اور ایما نے دیکھا کہ ایک بہت بھاری پتھر ہوا میں معلق تھا۔ مصری نے چراغ اس پتھر کے اوپر رکھ دیا۔وہ شخص گھر میں اکیلا رہتا تھا۔اُس نے بڑے بڑے سنگلاخ ہاتھوں سے کھانا تیار کیا۔کھانا کھانے کے بعد مصری نے بات سنائی۔

''قریب قریب سوا دو ہزار سال پہلے کی بات ہے جب فرعون چیوپس نے اہرام بنانے کا فیصلہ کیا۔ طے پایا کہ اہرام کی بلندی اس حد تک حیرت انگیز ہو کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں دل دھڑکنے لگیں۔ یہ بھی طے پایا کہ اہرام میں فرعونوں کے مقبرے ہوں گے۔ دماغ میں یہ تھا کہ مرنے کے بعد لوگ فرعونوں کو اہرام کی شکل میں دیکھیں اور عمارت کے شکوہ کے سامنے خود کو حقیر محسوس کریں۔ایک لاکھ آدمیوں نے اُس تعمیر میں حصہ لیا۔ بڑے ہرم کا مخروطہ زمین سے نکل کر آسمان کی طرف بلند ہونا شروع ہوا۔دریائے نیل کے دائیں کنارے پر جو پہاڑ تھے وہ پتھر کی کھدان بنے۔دیوہیکل پتھر کاٹے جاتے ،تراشے اور

چمکائے جاتے ،بغیر پہیوں کی گاڑی میں رکھ کر کھینچے جاتے اور جائے تعمیر پر لائے جاتے تھے۔گاڑی کو مزدوروں کا انبوہ گراں کھینچتا تھا۔سفر تیز کرنے کے لیے کھینچنے والوں کی پشت پر تازیانے برسائے جاتے تھے۔مزدور ادھڑی ہوئی پشتوں کے ساتھ کام کرتے تھے۔ پشت ہا پشت کام کرتے تھے۔ایک نسل تھک کر چور ہو جاتی اور مر جاتی تو اگلی پشت کام شروع کرتی۔اس قدر زور لگانا پڑتا تھا کہ آنکھیں اُبل آتیں اور ناف سے گوشت کی پوٹلی باہر جھانکنے لگتی۔مزدور ناف کے اوپر پتھر باندھتے تھے،اس خوف سے کہیں پیٹ پھٹ نہ جائے۔کئی مزدوروں کی اگلی پشت پیدا ہوتی تو نوزائیدہ بچوں کی پشت پر بھی پیدائشی چابک کے نشان ہوتے اور ناف کے سوا زخ سے گوشت باہر جھانکا کرتا تھا۔۔۔میں مزدوروں کی اسی نسل سے ہوں۔''مصری نے جب کھڑے ہو کر اپنی پیٹھ سے کپڑا ہٹایا تو چراغ کی لَو چابک کی پیدائشی شکنوں میں بیٹھ گئی۔

''ایک بوڑھا شخص جو میرے اجداد میں سے تھا۔اہرام کی تعمیر میں پچھلے پچیس برس سے کام کر رہا تھا۔اس کی پیٹھ کھرنڈ زدہ تھی اور اُس کی ناف پیٹ پر بندھے ہوئے پتھر پر دستک دیا کرتی تھی۔وہ گرمی کی دوپہر میں پتھر لدی گاڑی کھینچ رہا تھا۔خون اس کی ناف سے ٹپک ٹپک کر اُس کی ایڑیوں تک آتا تھا اور گرم زمین میں جذب ہوتا تھا۔بالآخر لڑکھڑا کر گرا مگر پتھر کھینچے کا عمل جاری رکھا گیا۔بوڑھا بدن مزدوروں کے پاؤں کی ضربیں کھاتا رہا اور آخر کار اُس کے دم توڑتے ہوئے بدن کے اوپر سے دیو ہیکل پتھر والی گاڑی گزری۔

بوڑھے کا بیٹا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔رات بیٹے نے باپ کے چیتھڑوں کو آگ لگائی اور اُس کی راکھ ایک برتن میں ڈالی۔برتن کے منہ پر کپڑا باندھا اور سو گیا۔صبح جب وہ اٹھا تو کیا دیکھا ہے کہ راکھ بھرا برتن ہوا میں معلق ہے۔یہ منظر دیکھنے پر بھی بیٹا حیرت زدہ نہیں تھا۔ اُس نے بچپن سے اپنے باپ کو پتھر اُٹھاتے دیکھا تھا۔اُس کی ابھری ہوئی ناف اور پھٹے ہوئے پیٹ کو دیکھا تھا۔اُس کی ابلی ہوئی آنکھوں کو دیکھا تھا۔فرعونوں نے اُس کے باپ کی

مٹی کو اتنا خراب کیا تھا کہ اُس کی ہیئت بدل گئی تھی۔ زمین کی کشش ثقل اس کے باپ کی مٹی پر بے اثر ہوگئی تھی تو اس میں اچنبھے کی کیا بات تھی۔ اگر اس سے بڑا معجزہ بھی رونما ہو جاتا تو عین ممکن تھا۔ پھر بیٹے نے دیکھا کہ جس چیز میں وہ اپنے باپ کی راکھ ملاتا تھا وہ ہوا میں معلق ہو جاتی۔ یہاں تک کہ اگر منوں مٹی میں راکھ کا ایک ذرہ بھی ملتا تو وہ مٹی عمل کرتی اور پھر نوبت یہاں تک آ گئی کہ راکھ زدہ مٹی کسی عام مٹی کو چھوتی تو وہ مٹی بھی عمل زدہ ہو جاتی۔ اب بیٹے نے باپ کی جگہ مزدوری شروع کی۔

ایک دیوہیکل پتھر گاڑی پر کھینچا جا رہا تھا۔ سینکڑوں مزدور پسینے میں شرابور تھے۔ ان کی گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ آنکھوں کی سفیدی خون رسنے سے رنگ دار تھی۔ بیٹے نے ذراسی مٹی پتھر پر ملی تو پتھر گاڑی سے اٹھا اور ہوا میں کھڑا ہو گیا۔ مزدور اتنے نڈھال تھے کہ ان کے اوسان پتھر کے ہو گئے تھے۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں اور نکلی ہوئی زبانوں کے ساتھ گاڑی کھینچتے رہے۔ اعصاب اس قدر شل تھے کہ جس طرح وہ پتھر لدی گاڑی کو کھینچتے تھے اسی رفتار سے خالی گاڑی کھینچی جارہی تھی اور ان کے پیچھے پیچھے وہ معلق پتھر ہوا میں دھکیلتا جا رہا تھا۔۔۔ ''میرے پاس عمل والی مٹی ہے نسل در نسل مجھ تک آئی ہے۔'' مصری نے بتایا۔

ایما نے معلق پتھر پر جلتے ہوئے چراغ کو دیکھا۔ مصری نے بات جاری رکھی۔

''سب سے بڑا اہرم بن گیا۔ سب سے بڑا فرعون مر گیا۔ جب اُس کی لاش حنوط کرنے کا وقت آیا تو بیٹے نے کہا کہ یہ کام وہ کرے گا۔ اس کی لاش پر عمل والی مٹی ملی تو فرعون کی لاش اہرام کے اندر ہوا میں معلق ہو گئی۔ وہ لاش کے برابر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں کی ایک انگلی فرعون کی ناف میں ڈالی اور ایک جھٹکے سے فرعون کے پیٹ کو اُدھیڑ دیا۔ گوشت کا ایک ٹکڑا اُس کے پیٹ سے نکالا اور نفرت سے فرعون کے مُردہ چہرے پر دے مارا۔ گوشت کا ٹکڑا چہرے سے دُور ہوا میں معلق ہو گیا۔۔۔''

ایما نے زینو کی طرف دیکھا جو اطمینان سے مصری کو سن رہا تھا۔ ایما نے سناٹا توڑتے ہوئے پوچھا:

''مگر مٹی کو ہاتھ لگانے سے انسان ہوا میں معلق کیوں نہیں ہو جاتا؟''

''مٹی صرف بے جان چیزوں پر عمل کرتی ہے۔۔۔'' مصری نے بتایا۔

''تو کیا چیزیں ہمیشہ کے لیے ہوا میں معلق رہتی ہیں؟'' ایما نے پوچھا۔

''عمل والی مٹی دوبارہ اُسی جگہ لگائی جائے تو ردِعمل کرتی ہے۔'' مصری نے بتایا۔

———————

سکندر کے لشکر نے مصر کی زمین کو چھوا۔ لشکر صفیں باندھے ہوئے تھا۔ قطار اندر قطار گھوڑے دوڑتے تھے۔ سب سے آگے سکندر کا گھوڑا تھا۔ ذرا فاصلے پر سراب تھا۔ جو گھوڑوں کی رفتار کے برابر آگے آگے بھاگ رہا تھا۔ یکایک سراب میں خلل واقع ہوا اور سراب کا لرزتا ہوا شیشہ اپنے پاؤں پر بلند ہونا شروع ہوا۔ ایستادہ سراب کشتی کے بادبانوں کی طرح پھڑ پھڑانے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک بہت بڑی کشتی کے خال وخد واضح ہوئے۔ سکندر نے رُک کر مساحت کنندگان کو طلب کیا۔

''نقشے کے مطابق تو آگے سمندر نہیں ہے تو کیا ہم راستے سے بھٹک گئے ہیں؟'' سکندر نے پوچھا۔

کشتی کو غور سے دیکھنے پر کھلا کہ اس کے آگے چند چوپایوں کی شبیہیں لرز رہی تھیں۔ لشکر دوبارہ چلا۔ ذرا آگے بڑھنے پر سکندر نے دیکھا کہ ایک کشتی ہوا میں کھلے بادبانوں کے ساتھ صحرا میں چل رہی ہے۔ جس کی رفتار بڑھانے کے لیے بیس گھوڑے کشتی سے بندھے ہوئے رسوں کو کھینچ رہے ہیں۔ سب سے اگلے گھوڑے پر ایک عورت سوار ہے جس کے سنہری بال ہوا میں اڑ رہے ہیں۔ اچانک بادبانوں کا رخ بدلنے لگا اور گھوڑے بھی

رک گئے۔ کشتی ایک آدمی کے قد کے برابر ہوا میں معلق تھی۔ کشتی سے لچکیلی سیڑھی گرائی گئی۔ زینو سیڑھی پر پاؤں دھرتا ہوا زمین پر اُترا۔اس نے اشارے سے سکندر کو گھوڑے سے اُترنے کے لیے کہا۔سکندر بے ساختہ اُترا اور زینو کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''کشتی سونے سے بھری ہوئی ہے۔سونا خالصتاً خالص ہے۔ملاوٹ کا ایک ذرا بھی اس کی ڈلیوں میں نہیں ہے۔سوائے اس ہوا اور روشنی کے جوان کی سطح پر بیٹھ کر چمک دیتی ہے۔تم یہ سونا لے لو اور واپس چلے جاؤ۔اگر تم مصر میں داخل ہو گے تو مصری تمہارے سر پر فرعون کا تاج رکھیں گے۔جس کی وجہ سے تمہاری رعونت دو چند ہو جائے گی اور تمہاری وحشت کو دو آتشہ کر دے گی۔قتل و غارت کا آسیب تمہارے تھکے ہوئے دماغ میں پھر سے جوان ہو گا اور تم ان دیکھے علاقوں میں دہشت گردی کے لیے نکل جاؤ گے۔'' زینو بولا۔

سکندر نے آنکھیں جھکا لیں اور چپ رہا۔

''تم اپنے لشکر کو سونگھ نہیں سکتے۔چونکہ تم ان میں سے ہو۔تمہارے لشکر سے بو آتی ہے۔تمہارے سپاہی سالہا سال کی قتل و غارت سے خون آلود ہیں۔لشکر سفر میں ہو تو خون کی بو اس کے گرد ہیولے کی طرح لپٹی رہتی ہے۔خواہ راستے میں جھلیں آئیں یا دریا۔چلتے ہوئے لشکر کی بو کے آگے سمندر بھی بے بس ہوتا ہے۔کیونکہ سپاہی عجلت میں نہاتے ہیں اور اکثر اوقات اپنے ہتھیاروں کو دھونا بھول جاتے ہیں۔'' زینو بولا۔۔۔سکندر چپ رہا۔

''تم ٹرائے میں ایکلیس بنتے ہو،مصر میں فرعون اور بابل و نینوا میں دارا۔یہ کیسا بہروپ ہے۔تم خونی اور گشتی تھیٹر لے کر ملکوں ملکوں گھومتے ہو۔چہرے پر خون مل کر مسلح اداکاری کرتے ہو۔۔۔یہ تمہاری فوج تمہارا کورس ہے،جو تمہاری آواز میں اپنی آواز ملاتا ہے۔مرتے ہوئے جسم چیختے ہیں اور میدان جنگ میں دایونیسس کی شبیہہ رقص کرتی ہے۔یہ ڈرامے کی کون سی قسم ہے؟'' زینو بولا۔۔۔سکندر چپ رہا۔

''سونا خالصتاً خالص ہے'' زینو دوبارہ بولا۔سکندر چپ رہا۔

’’کیا دارا کی دولت کا حصول تمہاری ترجیح نہیں ہے؟‘‘ زینو نے پوچھا۔

’’ہے۔۔۔مگراولین ترجیح نہیں۔‘‘ سکندر نے کہا۔

’’اورترجیحات کیا ہیں؟‘‘ زینو نے پوچھا۔

’’تم جانتے ہو۔۔۔!‘‘ سکندر نے کہا۔

’’جانتا ہوں۔۔۔جانتا ہوں مگر سمجھ نہیں سکتا۔‘‘ زینو بولا۔

سکندر واپس مڑا اور گھوڑے پر سوار ہوا۔لشکر کشتی سے گریز کرتا ہوا آگے بڑھا۔ زینو نے سکندر کو آواز دے کر کہا۔

’’مصر کی مٹی سے خوشبو آتی ہے۔راہ میں دریائے نیل ہے۔اپنی فوج سے کہنا کہ اچھی طرح نہالے اور ہتھیار بھی دھولے۔‘‘

زینو کشتی میں سوار ہوا اور بادبان درست کیے۔ ایما نے گھوڑوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔۔۔کشتی ہوا میں تیرنے لگی۔زینو نے عرشے سے دیکھا۔سکندر کا لشکر سراب کی لرزش میں داخل ہوا اور کانپنے لگا۔پھر رفتہ رفتہ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا۔کشتی بحرۂ احمر کی طرف بڑھنے لگی۔ہارا ہوا دارا بیابانوں میں مارا مارا پھرنے لگا۔اس پر اپنی ہی سلطنتِ فارس کی پہنائی تنگ ہورہی تھی۔سکندر اگرچہ جیتا مگر نیم دارائی ہوگیا۔اُس نے سلطنت فارس کا شاہی لباس پہننا شروع کیا۔وہ پاؤں تک فرغل میں چھپ گیا۔جس کے کمر بند کی گرہ سے جھملاتے پھندنے لٹکتے اور چال کی تائید میں سر ہلاتے تھے۔اُس نے نا ؤنوش کے لیے مخروطی جام استعمال کرنا شروع کیے،جن کے نقرئی پیندوں سے شاخِ سیمیں زمین پر دائرے کی شکل میں پھیل کر جام کو توازن دیتی تھی۔مالِ غنیمت میں حسین عورتیں بھی شامل تھیں۔ جن کے مفتوح ومجبور ناز واَدا فاتحین کی سر پرستانہ مسکراہٹ پر شہوانیت کا چھینٹا چھینکتے تھے۔

پرسی پولس کا مقام تھا۔فاتح سکندری لشکر نے مالِ غنیمت لوٹنے کے لیے غارت

گری کی انتہا کر دی۔ دیگر نوادرات کے علاوہ ان کے ہاتھ ایک لاکھ بیس ہزار ٹیلنٹ سونا لگا۔ سکندر نے عظیم الشان جشن کا اعلان کیا۔ وہ رات کے وقت زر و جواہر میں لدا پھندا تخت پر بیٹھا تھا۔

مخروطی جام بھرے ہوئے تھے۔ بیسیوں رقاصائیں ناچ رہی تھیں۔ موسیقی کی دُھن پر جھومتے ہوئے سپاہی دادِ عیش دے رہے تھے۔ ایک ایرانی مصاحب سکندر کے قدموں میں سجدہ ریز ہوا اور پھر اُٹھ کر احترام سے بولا:

''آپ کی ملاقات آئی ہے۔۔۔!''

''کون ہے؟'' سکندر نے خمار آلود آنکھیں مصاحب کے چہرے پر جمانے کی کوشش کی تو نظریں پھسل کر نیچے جا گریں۔

''ایک شخص ہے۔ اکیلا ہے اور غیر مسلح ہے۔'' مصاحب نے بتایا۔

سکندر آہستہ آہستہ تخت سے اُٹھا۔ اُس کی آنکھوں کا خمار رات کی تاریکی نے نگل لیا۔ اُس کا پاؤں مخروطی جام کے پیندے سے ٹکرایا تو جام کی شاخِ سیمیں نے توازن کھو دیا۔ جام لڑکھڑا کر ایک سجدہ ریز مصاحب کے سر پر گرا۔ جو تمام محفل کے ساتھ سکندر کے احترام میں زمین بوس تھا۔ آلاتِ موسیقی خاموش تھے۔ سازندے اور رقاصائیں بھی سجدے میں تھیں۔ زمین پر بچھی ہوئی انسانوں کی جھیل تھی، جس کے ایک کنارے پر سکندر کھڑا تھا اور دوسرے پر زینو۔ سکندر آہستہ آہستہ چلتا ہوا زینو کے پاس آیا۔

''سونا خالصتاً خالص ہے۔ کشتی خلیج فارس میں کھڑی ہے۔'' زینو بولا۔ سکندر چپ رہا۔

زینو نے سکندر کے فرغل پر چمکتے ہوئے سونے کے سکوں پر ہاتھ پھیرا اور کہا:

''یہ سونا ملاوٹ زدہ ہے۔ میرے پاس خالص چیز ہے۔۔۔ لے لو۔''

سکندر چپ رہا۔ زینو نے تاج کو دیکھا جو سکندر کے سر پر جھلملا رہا تھا اور بولا:

''اتنی قتل وغارت اور محنت کے باوجود بھی اگر چیز خالص نہ ملے تو بد قسمتی ہے۔''

سکندر چپ رہا۔

''تم جیت گئے مگر دارا بن گئے ۔۔۔تو جیتا کون؟'' زینو نے پوچھا۔سکندر چپ رہا۔

''سونا خالصتاً خالص ہے۔کشتی خلیج فارس میں کھڑی ہے۔میں دو دن تمہارا انتظار کروں گا۔''

یہ کہہ کر زینو اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

اندھیرے میں گھوڑے کی ٹاپیں بلند ہوئیں جو رفتہ رفتہ مدہم ہوتی گئیں۔

سکندر نے قریب پڑے ہوئے دو جام اپنے حلق میں اتارے اور چیخ کر جشن تازہ کرنے کا اعلان کیا۔رقص جاری ہوا مگر سکندر کی خالی نظریں رات کے کالے سمندر کو چیرتی رہیں۔

دو دن گزر گئے۔زینو نے کشتی کے پیندے میں برچھی ماری تو اَنی کشتی کو پھاڑ کر خلیج فارس میں اُتر گئی۔زینو نے بادبانوں کا رُخ متعین کیا جو بحر ہند کے مرکز کی جانب تھا۔چلتی ہوئی کشتی سے زینو اور ایما نے پانی میں چھلانگ لگائی اور تیرتے ہوئے ساحل تک آ گئے۔دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھے۔زینو نے گھوڑے کو ایڑ لگائی ۔ایما نے ایڑ لگانے سے پہلے کشتی کو دیکھا۔جس کے بادبانوں پر ہلکی چاندنی چمک رہی تھی اور وہ پھڑ پھڑاتے ہوئے کشتی کو بحرِ ہند کی طرف دھکیل رہے تھے۔ایما نے گھوڑے کو ایڑ دی اور کچھ دیر بعد زینو سے آملی۔

———————

ٹیکسلا میں موسمِ بہار تھا۔رنگ رنگ کے رنگ تھے۔پھولوں کی کیاریوں میں گیرو رنگ سبقت پر تھا۔اُس کے بعد زرد رنگ بہتات کرتا تھا۔ایما ایک پھول توڑنے لگی تو زینو

نے بے ساختہ اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھ کے ہولے سے دبایا۔ ایما کی انگلیوں کی پوریں پھول کی ٹہنی پر نرم پڑ گئیں۔

''یہ پھول نہ توڑو۔'' زینو نے کہا۔

کچھ تلاش کے بعد زینو نے ایک اور پھول توڑا اور ایما کو لا کر دیا تو وہ مسکرائی۔

زینو اور ایما کو ٹیکسلا کی پر اسرار اور خوابیدہ خاموشی بہت پسند آئی۔ زینو ایما کے ساتھ وہاں کے سکولوں میں جاتا جو پہاڑوں میں واقع تھے۔ سکولوں کے احاطوں میں زرد اور نارنجی رنگ کے ڈھیلے لباسوں میں ڈھکے طلبہ نرم روی سے حرکت کرتے تھے۔

موسمِ بہار کا پورا چاند پہاڑیوں کی اوٹ سے نکلا تو زینو اور ایما نے اسے تیزی سے بلند ہوتے ہوئے دیکھا۔ پہاڑیاں سیاہ ہو چکی تھیں مگر دونوں کے گرد کھلے ہوئے پھول اپنا رنگ بتاتے تھے۔ دور ایک سیاہ دھبہ لرزنا شروع ہوا جو ترقی کرتے کرتے ایک انسانی پیکر بن گیا۔ قریب آ کر وہ شخص انہماک سے دونوں کو دیکھتا رہا جو چاند پر نظریں جمائے مسکرا رہے تھے۔ وہ بھی ان کے قریب بیٹھ گیا۔ سنسکرت میں بولا:

''ٹیکسلا کی رات کو جب چاند ہوتا ہے تو سورج کم کم یاد آتا ہے۔''

زینو مسکرایا۔ ایما نے کہا:

''آپ نے بڑی خوبصورت بات کی۔'' وہ شخص بولا۔

''آپ کا نام؟'' ایما نے پوچھا۔

''کوتلیہ چانکیہ۔'' وہ بولا۔

''میں ایما ہوں اور یہ زینو۔'' ایما نے زینو کو کہنی ماری تو وہ چاند سے اُترا۔

''ہوں! زینو!! آپ کا نام ادا کریں تو کھوپڑی اور کانوں میں گونجتا ہے۔'' چانکیہ نے شرارت کی۔

''آپ کا نام گردن میں گھنٹیاں پہنے ہوئے ہے۔۔۔کوتلیہ۔۔۔چانکیہ!''

زینو بولا۔

تینوں ہنسے تو گونج اور گھنٹیاں پہاڑوں سے ٹکرائیں۔

''ٹیکسلا کے لوگ شاید بھاری گھنٹیاں استعمال کرتے ہیں۔اس لیے وہ مجھے برہمن۔ کوتلیہ ۔۔۔اچاریہ۔۔۔چانکیہ کہتے ہیں۔'' چانکیہ نے اپنا نام خوب بجا کر دونوں کو سنایا۔

تینوں چاندی ڈھلے پھولوں میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔چانکیہ نے بتایا کہ وہ اُن دنوں ایک کتاب لکھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔جس کا عنوان ''ارتھ شاستر'' ہوگا۔

''یہ کتاب حکومت کے اسرر ورموز سے متعلق ہے۔میں یونان کی شہری ریاستوں کا موازنہ مشرقی ایشیا کی سلطنتوں سے کر رہا ہوں۔ایک مرکزی ریاست کا خواب پیش کرنا چاہتا ہوں۔میں چندر گپت موریہ کا دوست اور مشیرِ خاص ہوں۔ہم دونوں کو نندا سے ریاست بدر کر دیا گیا ہے۔جس کا صدر مقام پاٹلی پتر ہے۔۔۔میں نے سکندرِ اعظم کے معرکوں کے متعلق بہت کچھ سن رکھا ہے۔آج کل چندر گپت موریہ بھی ٹیکسلا میں ہے۔ہم دونوں سکندر کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں۔جو ایک آدھ دن میں یہاں پہنچنے والا ہے۔دراصل سکندر کی لشکر کشی نے قریب قریب تمام دنیا کو وحدت میں پرو دیا ہے اور اس طرح ایک عظیم عالمی حکومت وجود میں آئی ہے۔۔۔تم دونوں کے نین نقش یونانی دکھائی دیتے ہیں اس لیے میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ کیں۔تمہارا تعلق یونان کے کس علاقے سے ہے؟''

زینو نے چاند کو دیکھنا شروع کر دیا اور بولا۔

''ہمارا تعلق یونان سے نہیں ہے!''

''تو کہاں سے ہے؟'' چانکیہ نے پوچھا۔

''یہاں سے ہے!'' زینو نے زمین کو تھپتھپایا۔

چانکیہ کچھ دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔

''دراصل حکومت کرنا ایک فن ہے اور یہ فن۔۔۔''

''سنا ہے شمال میں بہت اونچے پہاڑ ہیں۔ جن کی برف کبھی نہیں پگھلتی۔'' زینو نے چانکیہ کی بات کاٹی۔

''ہاں بہت بلند و بالا اور قابلِ دید پہاڑ ہیں۔۔۔ مگر آفرین ہے سکندر پر جو لشکر کشی کرتا ہے تو کیا پہاڑ اور کیا ویرانے، کیا دشت اور کیا صحرا۔۔۔'' چانکیہ نے کہا:

''سنا ہے ان پہاڑوں پر چڑھیں تو سانس لینے کے لیے بار بار ٹھہرنا پڑتا ہے!''

زینو بولا:

''ہاں ہاں! بہت بلند ہیں۔ ہوا ہلکی ہو جاتی ہے اور پاؤں شل۔ پہاڑ سرحدوں کا کام خوب کرتے ہیں۔ دشمن کی یلغار روکتے ہیں مگر سمندر تو۔۔۔''

''سنا ہے پہاڑ کی چوٹی سے چاند بڑا نظر آتا ہے؟'' زینو نے پھر ٹوکا۔ چانکیہ نے کہا:

''کیا سکندر آپ کی چھیڑ ہے۔ میرا مقصد کیا آپ سکندر کے ذکر سے چڑتے ہیں؟''

زینو مسکرایا اور اس سے کہا:

''کیا آپ کو برفیلے پہاڑ اچھے نہیں لگتے؟''

''اچھے لگتے ہیں۔ آج کل موسمِ بہار ہے۔ تین ماہ میں راستوں پر جمی ہوئی برف پگھل جائے گی اور سفر آسان ہو جائے گا۔ اگر آپ کو اونچے پہاڑ دیکھنے کا اشتیاق ہے تو ایک ماہ بعد سفر شروع کیا جا سکتا ہے۔'' چانکیہ نے بتایا۔

''ٹیکسلا کی مٹی بڑی زرخیز ہے۔ پنینی یہاں کی درسگاہ کا طالب علم تھا۔ جس نے سنسکرت زبان کی صرف ونحو لکھی۔ پنینی کو یونانی زبان کا علم تھا۔'' ایما نے کہا۔

''ہاں! یہ علم کا گہوارہ ہے۔ یہاں چارک نے علم طب پر کتاب لکھی۔ سشروت

نے علمِ جراحی پر تحقیق کی۔ یہاں علم الاعضاء کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔لوگ مردہ انسانی جسموں کو کھول کر نظامِ جسم پر تحقیق کرتے ہیں۔ یہاں جانوروں کے شفا خانے بھی ہیں۔علمِ ریاضی سکھایا جاتا ہے۔شُنی اور دشملو کا استعمال یہاں کے علمِ ریاضی کا حصہ ہے۔۔۔چانکیہ نے کہا۔

''آپ نے کچھ دیر سے سکندر کی بات نہیں کی۔''زینو نے چاند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کرنے نہیں دیتے۔'' چانکیہ چونک کر بولا اور ہنسا۔

سکندر کا لشکر ٹیکسلا میں داخل ہوا۔سکندر کے ساتھ اس کی ملکہ رخسانہ کی سواری تھی۔سارا شہر سواگت کے لیے پھوٹ پڑا۔باجوڑ، خیبر اور دوسرے دروں سے بہتے ہوئے انسانی دھارے ایک جھیل کی صورت میں ٹیکسلا وارد ہوئے۔لوگ سکندر کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اپنے پنجوں پر اُچھلتے تھے۔اردگرد کے راجہ ہاتھیوں کے جلوس لے کر سکندر کے استقبال کو آئے تھے۔شوخ رنگ کی ریشمی جھولیں ہاتھیوں کو ڈھکے ہوئے تھیں۔سونے اور چاندی کی زنجیروں کے ساتھ گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔جو ہاتھیوں کی مست خرامی کے باعث ہلکی ہلکی جھنکار دیتی تھیں۔رات کو جشن منایا گیا۔عظیم الشان ضیافت ہوئی۔بے شمار بیل اور بکرے ذبح کیے گئے۔بھنے ہوئے گوشت کی اشتہا آور مہک پر شہنائیوں کی دھن لرز رہی تھی۔

''آپ کی ملاقات آئی ہے!'' ٹیکسلا کے ایک مفتوح درباری نے زمین پر ماتھا ٹیکتے ہوئے کہا۔سکندر کے ہاتھ کی گرفت رخسانہ کی ہتھیلی پر ڈھیلی پڑ گئی۔

''ملاقاتی نے اپنا گھوڑا آپ کی سواری کے لیے بھیجا ہے۔''

گھوڑے نے سکندر کو اُٹھایا اور لے گیا۔

ایما اکیلی کھڑی تھی۔ موسم بہار کی ہوا میں اس کے سنہری بال اُڑ رہے تھے۔ جن کی لہروں میں چاندنی جھلملاتی تھی۔

''یہ تکشا شیلا ہے، جس کی مٹی میں بُدھا کی خوشبو ہے اور جس کی ہوا کے جھونکوں میں مہاویر کا لمس ہے۔ ارسطو سے بہت پہلے بُدھا نے کہا تھا کہ دو انتہاؤں کے درمیان راستی کا راستہ۔ میانہ روی کا سنہرا راستہ ہے۔ یہ راستہ راستی کے آٹھ اصول سمجھا تا ہے۔ یعنی درست خیال، صحیح ارادہ، راست گوئی، خوش اسلوبی، عین زندگی، سعی حاصل، شدھ حواسی اور فکر رسا۔۔۔

بُدھا نے نفس کے ساتھ جنگ کی تھی اور نروان پایا تھا۔ نروان بانٹا تھا۔ بدھا کا جسم عمل والی مٹی سے بنا تھا۔ جو دنیاوی آلائشوں سے بلند تھی۔۔۔ تکشا شیلا کی مٹی میں بُدھا کی خوشبو ہے اور اس کی ہوا کے جھونکوں میں مہاویر کا لمس ہے۔ مہاویر نے کہا تھا کہ روح کو کرما کے کرب سے بچانے کے لیے چند پرہیز ضروری ہیں۔ یعنی قتل، چوری، جھوٹ، جنسی بے راہروی اور ذاتی ملکیت سے پرہیز۔۔۔

یونانیوں کی کئی باتوں کا علم ہے اور بہت سی باتوں کا علم نہیں ہے۔ تم چونکہ یونانی ہو، اس لیے تمہیں کچھ باتیں بتانا تھیں۔ اب تم جاؤ۔''

ایما بولی۔ سکندر سر جھکائے کھڑا تھا۔

''تکشا شیلا کے حکمران پہلے دارا اور اس کے آباؤ اجداد کے باج گزار تھے۔ آئندہ تمہارے ہوں گے۔ یہاں کے حکمرانوں نے دارا کا نام سکندر رکھ دیا ہے۔ مگر ان باتوں سے مٹی کی خوشبو نہیں بدلتی اور ہوا کا لمس بھی تبدیل نہیں ہوتا۔ اب تم جاؤ۔'' ایما بولی۔

اس قدر حسین عورت سکندر نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اسے رخسانہ بھول گئی۔ سکندر اب تک کئی حسیناؤں سے استفادہ کر چکا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ایما کو چھو کر دیکھے۔ مگر

ایما کے جسم پر زینو کا لمس ایک ہیولا بن کر گردش کرتا تھا۔ مالِ غنیمت کی حسین ترین دوشیزہ پر سکندر کا حق ہوتا تھا۔ آج تک کسی دوشیزہ نے سکندرانہ سپردگی کے لیے مزاحمت نہیں کی تھی۔ مگر پہلی دفعہ وہ حسنِ بے مثال کے سامنے بے بس تھا۔ چھونا تو درکنار سکندر کو سر اُٹھانے کا یارا نہیں تھا۔۔۔ کہ ایک بھرپور نظر پیکرِ جمال پر ڈال سکے۔ سر اُٹھاتا بھی تو کیسے کہ ایما کے جسم پر زینو کا ہیولا تھا۔ اس کے پاؤں کے نیچے ٹیکسلا کی خوشبودار مٹی تھی اور اس کے جسم کو چھوتی ہوئی ہوا میں مہاویری کا لمس تھا۔

سکندر نے کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے۔ تیز ہوا کا جھونکا آیا۔ سکندر کے فرغل پر سونے کے سکے جھنجھنائے۔ سکندر کی نظر ملبوس پر چمکتے ہوئے سونے پر پڑی۔ اَن کہی بات اُس کے خیال میں دم توڑ گئی۔ وہ مڑا اور گھوڑے پر بیٹھ کر واپس روانہ ہوا۔

زینو اور ایما نے چند ماہ ٹیکسلا میں قیام کیا۔ شمال سے چلنے والی ہوائیں ٹیکسلا تک پہنچتے گرم ہونے لگیں جو برفیلے راستے کھلنے کا اشارہ تھا۔ دونوں نے شمال کا رُخ کیا۔

وہ دُنیا کے بلند ترین پہاڑ دیکھنا چاہتے تھے۔ جوں جوں وہ شمال کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اسی تناسب سے آبادیوں کے درمیان فاصلے بڑھتے جا رہے تھے۔ وقت آیا کہ گھوڑوں کی جگہ خچروں کو لینا پڑی۔ ایک خچر پر زینو سفر کرتا تو دوسرے پر ایما۔ تیسرے پر زادِ راہ ہوتا تھا۔ ایک بستی سے دوسری تک پہنچتے پہنچتے ایک دن لگتا تھا۔ چالیس دن سفر کرنے کے بعد وہ ایک بستی میں قیام پذیر ہوئے۔

''یہ آخری بستی ہے۔'' جھونپڑی والے نے بتایا۔ جس کے پاس دونوں ٹھہرے تھے۔

''ہم اس پہاڑ پر چڑھنا چاہتے ہیں۔'' ایما نے اونچے برف پوش پہاڑ کی طرف اشارہ کیا۔''

''راستہ دشوار ہے۔ برف بہت زیادہ ہے۔ اس پہاڑ پر ایک دن سے زیادہ

چڑھنا ناممکن ہے۔ کیونکہ ہوا ختم ہو جاتی ہے۔اس پہاڑ کی چوٹی سے چاند بہت بڑا نظر آتا ہے۔'' میزبان نے بتایا۔

''کیا کسی نے چوٹی پر چڑھ کر چاند کو دیکھا؟'' ایما نے پوچھا۔

''نہیں۔'' میزبان نے کہا۔

''تم ہمارے ساتھ پہاڑ پر چڑھو گے؟'' ایما نے پوچھا۔

''نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں اس پہاڑ پر ہر سال برف کا سیلاب آتا ہے اور گڑگڑاہٹ کے ساتھ کسی کھائی میں گر کر خاموش ہو جاتا ہے۔ پھر پہاڑ پر گرنے والا سیلاب منجمد ہو جاتا ہے اور برف کے نیچے وقت جم جاتا ہے۔'' میزبان نے بتایا۔

باب سوم

بیسویں صدی ختم ہونے میں بیس سال رہتے تھے۔کلاس لگی ہوئی تھی۔کیمسٹری کا پروفیسر لیکچر دے رہا تھا۔

''ہیرا۔۔۔اپنی ہوشربا دلکشی اور چمکیلی شان وشوکت کی بدولت ہزاروں سال سے کروڑ ہا دلوں کی دھڑکن ہے۔ارمان ہے،آرزو ہے،محبت آمیز خواہش ہے۔۔۔ہوس ہے۔تاجِ شہی میں سجے تو شانِ خسروی ہے،انگوٹھی میں جڑے تو محبت کرنے والے دلوں کی تابناک علامت ہے اور خوردبینی شیشے کے نیچے پرکھا جائے تو کاربن ہے۔ہیرا۔۔۔کاربن ہے۔

کاربن کے ایٹم میں چھ الیکٹران ہوتے ہیں۔ایٹم مکمل ہونے کے لیے چار مزید الیکٹرانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔یہ ضرورت بھی کاربن ہی کے الیکٹران پوری کرتے ہیں۔جو کاربن کے دوسرے ایٹموں سے مل کر شریک گرفتہ بند بناتے ہیں۔کاربن کے ایٹموں کے یہ بند نہایت مضبوط اور دیرپا ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہیرا نہایت سخت اور

دائمی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تمام کاربن خلا سے زمین پر آئی ہے۔دَم توڑتے ہوئے ستاروں کی راکھ یعنی کاربن خلا میں اُڑتی رہی۔اربوں سال پہلے یہ راکھ نظامِ شمسی میں داخل ہوئی۔ پھر شہابِ ثاقب پر سوار ہوئی اور زمین پر برسی۔زمین کی بنتی بگڑتی تہوں میں اُتری۔سخت دباؤ اور تپش میں پرورش پائی۔آتش فشاں پہاڑوں نے لاوے کی صورت میں اسے زمین کی سطح پر اُنڈیلا تو ہیرے پاتال سے سطح زمین پر آ گئے۔

کاربن زمین پر باہر سے آئی ہے۔۔۔یہ اندر اور باہر کیا ہے؟ کیا اندر صرف زمین میں ہے۔۔۔اور باقی سب باہر ہے۔۔۔زمین کہاں سے آئی ہے؟ باہر سے آئی ہے؟ باہر کس اندر سے آیا ہے؟

بہت سے ہیرے ساڑھے تین ارب سال پرانے ہیں۔گویا انسانی اور حیوانی زندگی سے تین ارب سال پرانے لہٰذا یہ کہنا کہ ہیروں کی کاربن نامیاتی مادے کی شکست وریخت سے عمل میں آئی۔۔۔غیر یقینی ہے۔

روس کے سائنس دانوں نے مصنوعی ہیرے تیار کر لیے ہیں۔یہ ہیرے درمیانے درجے کی واشنگ مشین کی جسامت کے آلے میں بنائے جاتے ہیں۔جس میں دباؤ کی شدت ساڑھے آٹھ لاکھ پاؤنڈ اور درجہ حرارت تین ہزار فارن ہائیٹ ہوتا ہے۔اس طرح ڈیڑھ قیراط کا ہیرا پچاس گھنٹوں میں تیار ہوتا ہے۔اگرچہ مصنوعی ہیرا بالکل اصل معلوم ہوتا ہے مگر ایٹمی سطح پر کہیں کہیں کاربن کے ساتھ نائٹروجن کے ایک ایٹم کی آمیزش سے ہیرے کی شفافی میں پیلی جھلک پڑتی ہے۔جو اس کے مصنوعی ہونے کی غمازی کرتی ہے۔شنید ہے کہ روسی سائنسدان اس کمی پر جلد قابو پا لیں گے اور مصنوعی ہیرے کو قدرتی تابنا کی دیں گے۔یوں کہ جب روشنی کی شعاع تراشے ہوئے ہیرے پر گرے گی تو قوسِ قزح کے وہی رنگ پھوٹیں گے جو اصلی ہیرے کی سطح پر اُجاگر ہوتے ہیں۔۔۔"

تحسین اور برٹل ہم جماعت تھے اور گہرے دوست بھی۔ وہ اسلام آباد کے ایک انٹرنیشنل سکول میں پڑھتے تھے۔ برٹل کے والد پاکستان میں سویڈن کے سفیر تھے۔ برٹِل ان کا اکلوتا بیٹا تھا اور نا قابلِ یقین خداداد صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کی یادداشت عکاسانہ تھی اور نوعمری ہی میں اس کا علم حیرت ناک تھا۔ پتلا دُبلا جسم، سفید رنگت، بالا بلند قامت، ہلکے گھنگھریالے سنہری بال اور نمایاں نیلی آنکھیں جو دیکھنے والی نظر کو ٹھوکر دیتی تھیں۔ کیمسٹری ہو یا فزکس، بیالوجی ہو یا ریاضی، برٹل ہر علم کے لیے یکساں پسندیدگی رکھتا تھا۔ خداداد صلاحیتوں میں تحسین برٹل کا ہمزاد تھا۔ یہ الگ بات کہ امتحانات میں دونوں کے نمبر واجبی آئے تھے۔ مگر اساتذہ ان دونوں کی صلاحیتوں کے اس درجہ قائل تھے کہ اکثر ان کے ساتھ بات چیت کرنے کے لیے بیتاب رہتے۔ تحسین چھریرے جسم کا سانولا لڑکا تھا۔ جب سر جھکا کر کاپی پر لکھتا تو سیدھے سیاہ بال سر سے پھسل کر پیشانی کے سامنے ہلنے لگتے۔ وہ ٹیکسلا سے روزانہ اسلام آباد پڑھنے کے لیے آتا تھا۔

تحسین کے داد کو سرخ رنگ کے خواب آتے تھے۔ ہزار ہا سرخ رنگوں کے خواب۔۔۔ سرخ رنگوں کے ہزار ہا خواب کیونکہ انھوں نے ہندوستان کا بٹوارہ دیکھا تھا جب وہ امرتسر میں تھے۔ اُن دنوں انگریز ہندوستان کی تقسیم کر کے بھاگنے کے چکر میں تھا۔ امرتسر میں بسنے والے ہر شخص کے سر میں ہیجان سرسام کی طرح سرایت کر گیا تھا۔ ساون بھادوں کے دن تھے۔ جسموں کے اندر گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ شریانوں میں کوندے لپکتے اور آنکھوں سے بجلیاں گرتی تھیں۔ سینوں میں بادل گرجتے اور زبانوں سے نعرے برستے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ پورا چاند بادلوں سے باہر تھا۔ بھیگی ہوئی چاندنی کی چھاؤں میں تحسین کے دادا اور اُن کا خاندان پاکستان ہجرت کرنے کے لیے زادِ سفر باندھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں ایک زبردست دھکیل نے صحن کے دروازے کی زنجیر کو قفل سمیت توڑا اور دو آدمی گھر

میں داخل ہوئے۔ برچھے کی اَنی تحسین کی دادی کی گردن میں بائیں جانب سے داخل ہوئی، ہنسلی کی ہڈی پر توازن کرتے ہوئے اَنی نے نرخرے کو پھاڑا اور دائیں جانب سے باہر نکلی۔ یوں کہ دائیں بُنِ گوش سے بالا اُکھڑا جسے انی نے اپنے پھل پر پرولیا۔ عورت کے مرنے سے پہلے اُس کی چیخ مرگئی۔ چیخ کے اسقاط کا اتنا ردِعمل ضرور ہوا کہ خون کا فشار ایک فوارے کی صورت میں برچھے والے کے منہ پر تھوکا گیا۔ دادا کے منہ سے چیخ نکلی۔۔۔ چیخ کی آواز نسوانی تھی۔ قتل کا دورانیہ اگر چہ ایک لمحے پر محیط تھا مگر وہ ایک صدی کا دورانیہ لیے دادا کے تحت الشعور میں اُتر گیا۔ برچھے والوں نے انھیں اور ان کے کمسن بیٹے کو قتل نہ کیا۔ شاید وہ مرد کے گلے سے نسوانی چیخ سن کر گھبرا گئے تھے۔

تحسین کے دادا کو سرخ رنگ کے خواب آتے تھے۔ ہزار ہا سرخ رنگوں کے خواب۔۔۔ سرخ رنگوں کے ہزار ہا خواب۔ انھیں کبھی نیند آتی تو وہ خواب میں لہلہاتی فصلیں دیکھتے۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے اُن پر سرخ رنگ کی بارش ہونے لگتی۔ کبھی وہ بھاپ کے سیاہ انجمن کے پیچھے دوڑتے ہوئے ریل گاڑی کے ڈبے دیکھتے اور پھر ریل کی پٹڑی کے دونوں طرف سرخ رنگ کے فوارے چھوٹنے لگتے۔ سُرخ رنگ کی کئی پٹڑ یاں بن جاتیں اور گاڑی ہچکولے کھانے لگتی۔ انجن گرم ہو کر سرخ ہو جاتا۔ پھر پھٹ کر ڈبوں کی چھتوں پر گر جاتا۔

امرتسر میں ان کی بہت جائیداد تھی۔ جس کے بدلے انھیں لاہور میں شہری جائیداد کے علاوہ شہر کے نواح میں بیس مربعے زمین الاٹ ہوئی۔ مگر نیند اُچاٹ تھی۔ ایک بار وہ گھومتے گھماتے ٹیکسلا پہنچے۔ جوں ہی انھوں نے موہڑہ مرادو کے کھنڈرات میں قدم رکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک طرف سر بریدہ سٹوپا تو دوسری طرف نیند کھڑی ہے۔ چادر بچھا کر وہیں سو گئے۔ جب اٹھے تو تر و تازہ نقاہت جسم میں دوڑ رہی تھیں۔ کھنڈرات کے گارڈ نے بتایا کہ وہ چوبیس گھنٹے سوتے رہے ہیں۔ تحسین کے دادا نے لاہور کی کچھ زمین فروخت

کی۔انھوں نے کھنڈرات کے قریب بہت بڑی حویلی بنوائی اوراس میں رہنے لگے۔اب انھیں نیند آتی تھی۔گہری نیند کالمس گداز ہوتا تھا۔جب نیند اتھلی ہوتی تو خواب آتے، خوابوں کا رنگ سبز ہوا کرتا تھا۔انھوں نے تحسین کے والد کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ٹیکسلا کی خوابیدہ آب و ہوا کا تحسین کے والد پر یہ اثر ہوا کہ وہ بلند پایہ مجسمہ ساز بن گئے۔باپ کا فنِ سنگ تراشی جب تحسین کی پوروں تک پہنچا تو اس میں انتہا درجے کا نکھار پیدا ہوا۔ایک بار تحسین نے اپنے ہاتھ سے تراشا ہوا مہاتما بدھ کے سر کا نقش کیمسٹری کے پروفیسر کو پیش کیا۔ پروفیسر نے قدیم پتھر کی چھوٹی سے ٹکیہ پر مہاتما بدھ کا ابھرا ہوا سر دیکھا تو دیوانہ وار کہا۔

''نروانی خال وخد بنانے کے لیے ضروری ہے کہ فنِ سنگ تراشی کئی سال برگد کی چھاؤں تلے بیٹھے۔جس نے بھی یہ نقش بنایا ہے وہ عظیم مجسمہ ساز ہے۔اس قدیم اور عظیم تحفے کو قبول کرتے ہوئے مجھے اپنی غربت پر شرمساری ہے کہ بدلے میں دینے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔''

مگر جب تحسین نے اسے بتایا کہ یہ نقش قدیم نہیں بلکہ خود اس نے بنایا ہے تو پروفیسر نے نا قابلِ یقین نظروں سے تحسین کے کم عمر سراپے کو غور سے دیکھا اور پھر پتھر کے اُس نقش کو جو نروانی خال وخد کا شہکار تھا۔

برٹل کا تعلق سویڈن کے شہر مالمو سے تھا۔اُس کے والد سفارت کار ہونے کے علاوہ بے حد متمول خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔دُنیا کے کئی ملکوں میں اُن کی جائیدادیں تھیں۔برٹل کو پاکستان بہت پسند تھا۔جب بھی چھٹیاں ہوتیں تو برٹل اور تحسین سیر پر نکل جاتے۔کبھی گلگت تو کبھی سکردو،کبھی زیارت تو کبھی صحرائے چولستان،کبھی ہڑپہ تو کبھی موہنجوداڑو اور ٹیکسلا تو برٹل کا دوسرا گھر تھا۔اکثر جمعہ کے دن سکول بند ہونے کے بعد وہ تحسین کی کار میں بیٹھ کر ٹیکسلا آجاتا۔دونوں ہفتے اور اتوار کا دن مل کر گزارتے اور سوموار کو وہیں سے سکول آجاتے۔برٹل کے والد چار سال تک پاکستان میں سفیر رہے۔یہیں ریٹائر

ہوئے اور واپس سویڈن چلے گئے۔اول اول برٹل اور تحسین کا رابطہ خطوں اور فون کے ذریعے برقرار رہا پھر انٹرنیٹ کا دور آیا اور تواتر سے ای میل کا تبادلہ ہونے لگا۔دو تین سال کے بعد کبھی برٹل ٹیکسلا آتا اور کبھی تحسین مالمو جاتا۔جوں جوں وقت گزرتا رہا اُسی تناسب سے برٹل کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا رہا اور پھر وہ وقت آیا جب ساری دنیا نے اُس کی بے پناہ قابلیت کا اعتراف کیا۔اُسے علم و آگہی کا سمندر، عظیم فلاسفر، عظیم سائنسدان، عصرِ حاضر کا نمائندہ اور مجسم انسائیکلو پیڈیا کے خطابات دیے گئے۔برٹل کی شخصیت کو کسی مخصوص علم کی حد بندی میں مقید نہیں کیا جا سکتا تھا۔حیاتیات اور طب کے لوگ اُسے اپنے شعبوں کا حرفِ آخر سمجھتے تھے جبکہ طبیعات و کیمیا کے ماہرین اسے اپنے میدان کا شہ سوار۔نفسیات دان اپنی تحقیق زیادہ معتبر کرنے کے لیے اس سے رجوع کرتے تھے۔برٹل علم کو مختلف شاخوں میں بانٹنے کا قائل نہیں تھا بلکہ تمام علوم کو ایک ہی علم سمجھتا تھا۔

اقوام متحدہ کے چارٹر میں درج تھا کہ برٹل اینڈرسن ہر ملک کا شہری ہے۔اس پر ویزے کی کوئی پابندی نہیں۔وہ جب چاہے اور جہاں چاہے جا سکتا ہے۔خواہ اس کے لیے وہ اپنا ذاتی طیارہ استعمال کرے یا کسی بھی فضائی کمپنی کا۔یہ درج تھا کہ برٹل کے سفر کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے تمام دنیا کی فضائی کمپنیاں اپنا شیڈول فوری طور پر تبدیل کریں گی۔اُس کے تمام اخراجات کی ذمہ داری اقوام متحدہ برداشت کرے گی۔دنیا کے تمام ممالک اُسے سرکاری مہمان سمجھیں گے اور اُس کے اخراجات اقوام متحدہ کو بھیجیں گے،اس کی سکیورٹی کی تمام ذمہ داری اُس ملک پر ہوگی جہاں برٹل قیام کرے گا۔سکیورٹی کا کم از کم معیار امریکہ کے صدر کے برابر ہوگا۔

برٹل اکثر اپنے ذاتی خودکار طیارے پر سفر کرتا تھا۔جس کا ڈیزائن اُس نے خود بنایا تھا۔یہ طیارہ فوکر جہاز سے کچھ چھوٹا اور مخروطی شکل کا تھا۔پٹرول کے علاوہ شمسی اور ایٹمی توانائی سے چلتا تھا۔اُس کی آواز بہت کم تھی۔بس ایک گونج تھی جو کھڑے ہوئے جہاز کے

قریب سنائی دیتی تھی۔ یہ طیارہ رن وے کے علاوہ کسی بھی مناسب مقام پر عموداً اترنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ برٹل جب بھی ٹیکسلا آتا تو جہاز تحسین کی حویلی کے صحن میں اتارتا۔

اس بار جب جہاز کا دروازہ کھلا تو تحسین نے دیکھا کہ برٹل کے ساتھ نہایت حسین لڑکی ہے۔ دلکشی اور رعنائی کا پیکر۔ اتنی حسین کہ مجسمہ ساز کی آنکھیں چند ثانیے کے لیے پتھرا گئیں۔۔۔ یہاں تک کہ اس نے جھپکتے ہوئے پپوٹوں کی دستک سے انھیں دوبارہ زندہ کیا۔ تحسین تیوروں کا بیوپاری اور خال وخد کا سوداگر تھا۔ وہ چہروں سے تیور اور جسموں سے نقوش خریدتا اور پتھروں کے ہاتھ بیچتا تو مجسمے بنتے تھے۔ برٹل جہاز کی مختصر سیڑھیاں اترتے ہوئے تحسین کی تحسین آمیز نگاہوں پر مسکراتا تھا۔ برٹل اور لڑکی چلتے ہوئے اس شیشم کے گھنے درخت کے نیچے آئے جس کے نیچے تحسین اور پیچھے موسمِ بہار کی سہ پہر کا سورج تھا۔ برٹل نے تحسین سے ہاتھ ملایا اور اُس کا ماتھا چوما۔ لڑکی نے ہاتھ بڑھایا تو ہتھیلی زمین کی طرف تھی۔ یوں کہ ہاتھ تھام کر چوما جاسکتا تھا۔ جب تحسین نے ہاتھ چوما تو ہتھیلی سے وہی مہک جاگی جو برٹل کے چہرے کے گرد منڈلا رہی تھی۔

''تم دونوں کی خوشبو ایک ہے۔'' تحسین نے کہا۔ تینوں اس شدت سے کھلکھلا کر ہنسے کہ درخت پر بیٹھی ہوئی پرندوں کی ڈرا پھڑا پھڑا کر اُڑی۔ درخت سے پرندے اور ملبوس سے سایہ اُڑا تو دھوپ شیشم میں چھید کرتی ہوئی دھبہ دھبہ ان تینوں کے جسموں پر ملنے لگی۔ دھوپ لڑکی کے کپڑوں پر ہلی تو کھلا کہ اس نے گہرے نیلے رنگ کی شرٹ پہن رکھی ہے جسے تحسین سیاہ سمجھ رہا تھا۔

ڈرائنگ روم کی طرف سے چلتے ہوئے برٹل نے بتایا کہ لڑکی کا نام ایوا لو برینڈ ہے۔ اس کا تعلق سٹاک ہوم سے ہے۔ اسے مس یونیورس کے لیے چنا گیا تھا۔

''مگر میں نے یہ اعزاز لینے سے انکار کیا اور کہا کہ اصل مس یونیورس وہ ہے جسے برٹل کا ساتھ ملے۔'' ایوا نے بات مکمل کرتے ہوئے برٹل کے گلے میں بانہیں حمائل کیں اور

ہونٹوں کو چوما۔ وارفتگی میں برٹل کی گردن سے لٹک گئی اور پاؤں پیچھے کی طرف اٹھائے۔ پنڈلیوں پر لٹکی ہوئی سفید سکرٹ گھٹنوں تک آ گئی اور پنجاب کی بادِ بہاری میں اُس کے بدن کی خوشبو نے آمیزش پیدا کی۔

تحسین حویلی میں اکیلا رہتا تھا۔ اُس کے والد زیادہ تر لاہور میں اپنی جائیداد کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ چائے پیتے ہوئے تحسین نے دیکھا کہ اَیوا کی پیشانی پر چاندنی دمکتی ہے اور چھاؤں کے باوجود نیلی آنکھوں میں دھوپ چمکتی ہے۔ شانوں تک لٹکے ہوئے نیم لہریا بال رخساروں کی شفق کو کبھی چھپاتے اور کبھی اجاگر کرتے ہیں۔ مسکراہٹ کنجِ لب سے سفر کرتی ہے تو رخساروں میں چمک دے کر پھیل جاتی ہے۔

''میں آج کل ایک مجسمے میں مسکراہٹ تراش رہا تھا۔ آپ نے یہاں آکر میرا کام آسان کر دیا ہے۔'' تحسین نے ایوا سے کہا تو اس نے تحسین کا شکریہ ادا کیا۔

تحسین قدیم مجسموں کے نقشِ ثانی بنانے کے لیے مشہور تھا۔ اُس نے ٹیکسلا کے کھدائی سے نکلے ہوئے کئی مشہور مجسموں کے ''ریپلیکا'' بنائے تھے۔ اُس کے بنائے ہوئے ''ریپلیکا'' پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔ وہ گزشتہ کئی سال سے فاسٹنگ بدھا کا نقش ثانی بنانے میں مصروف تھا جو اُس نے گزشتہ دنوں مکمل کیا تھا۔ اس بار برٹل وہی نقشِ ثانی دیکھنے کے لیے آیا تھا۔ حویلی کا ایک ہال تحسین نے سٹوڈیو میں تبدیل کیا تھا جس میں پتھروں کے نیم تراشیدہ اور تراشیدہ مجسموں کا ہجوم رہتا تھا۔ ہال کے ایک کونے میں شوکیس تھا۔ تحسین نے بٹن دبایا تو شوکیس کے اندر لائٹیں روشن ہوئیں جو اس ترتیب اور زاویوں سے لگائی گئی تھیں کہ مجسمے کے سارے خال وخد پوری وضاحت سے نمودار ہوں۔ پتھر کی نگاریں سِل پر فاسٹنگ بدھا بیٹھا ہوا تھا۔۔۔ اپنے مخصوص آسن میں اگرچہ پاؤں نظر نہیں آتے تھے۔ مگر آغوش میں ڈھلکی ہوئی چادر کا جھول بتاتا تھا کہ پاؤں پر پاؤں رکھے ہوئے ہیں۔ دائیں ٹانگ کی قدرے بلند پنڈلی غمازی کرتی تھی کہ دایاں پاؤں بائیں پاؤں کے اوپر ہے۔ اس

بات کی گواہی چادر کا وہ پلو دیتا تھا جو دائیں ٹخنے کے قریب ابھرا ہوا تھا۔ دائیں ہتھیلی بائیں کے اوپر تھی، مگر یہ وریدیں ذرا دھندلا کر تراشی گئی تھیں تاکہ جلد کے نیچے نظر آئیں۔ چادر کا پلو دائیں کہنی سے ذرا اُوپر اور بائیں کہنی سے کچھ نیچے بازوؤں سے لپٹ کر آغوش میں ڈھلکا ہوا تھا۔ بائیں کہنی سے لپٹا ہوا چادر کا پلو پہلی نظر میں کپڑے کی بجائے بازو کے گوشت اور پوست کا حصہ معلوم ہوتا تھا اور دیکھنے والوں کو بتاتا تھا کہ سدھارت کے ساتھ اس کا ملبوس بھی تپسیا میں شریک ہے اور مستقبل کے نروان کا حصہ بننے والا ہے۔ کہنیوں کے اوپر بازوؤں کا گوشت گھل چکا تھا اور ہڈیاں نمایاں تھیں۔ سینے کے پٹھوں کی باریکی، پسلیوں کے پنجر اور کندھے کے جوڑوں کو نیم وضاحت سے یوں دکھاتی تھی جیسے مہین چلمن والے گھر میں رات کو چراغ جلایا جائے راہگیران سایوں کو دیکھتے ہیں، جو گھر میں رہتے ہیں۔ گردن کے پٹھے نسبتاً مضبوط تھے جو کھوپڑی کی اساس کو کاندھوں اور سینے سے جوڑتے تھے یوں کہ گردن ایستا وہ تھی اور کاسئہ سر عموداً ٹھہرا ہوا تھا۔ چہرہ زاویے پر تھا، یوں کہ خالی کاسئہ چشم کی کھوکھلاٹ کا رُخ بائیں جانب تھا۔ اس طرح۔۔۔ کہ سدھارت کی غائب آنکھیں اس زمین کو دیکھتی تھیں جو بائیں کندھے کے سامنے تھی۔ چہرے پر گندھی ہوئی گھنیری داڑھی تھی جس کی فراوانی رخساروں پر کم تھی مگر ٹھوڑی پر کثرت کرتی تھی۔ لمبے بالوں کا جوڑا گھما کر گنبدِ سر پر رکھا گیا تھا۔

مجسمہ تراشتے وقت اناٹمی اور کششِ ثقل کے اصولوں کو مدِ نظر رکھا گیا تھا۔ فاقہ زدہ بدھا کی ہڈیوں کے اُبھار اور پٹھوں کے زیروبم علم الاجسام کی ہر تعریف پر پورا اترتے تھے۔ جسم کے بالائی حصے کا پنجر زیادہ واضح تھا۔ جب کہ کہنیوں سے بازوؤں اور ٹانگوں پر گوشت کی نسبتاً فراوانی تھی۔ پسلیاں پوری بارہ بنائی گئی تھیں۔ برٹل نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور بولا:

''سگریٹ مجسموں کے لیے مضرِ صحت تو نہیں؟''

''نہیں''، تحسین نے ہنستے ہوئے کہا۔

برٹل نے سگریٹ کا دھواں تعریفی الفاظ میں لپیٹ کر چھوڑا۔

''زندہ ہیں تمہارے ہاتھ کہ پتھر میں جان ڈالتے ہیں۔ کیمسٹری کا پروفیسر ٹھیک کہتا تھا کہ نروانی خال وخد بنانے کے لیے ضروری ہے کہ فنِ سنگ تراشی کئی سال برگد کی چھاؤں تلے بیٹھے۔۔۔ اور تم بیٹھے ہو۔''

تحسین نے شوکیس کا دروازہ کھولا تو ایوا نے مجسمے کے بازو پر اپنی مخروطی انگلیاں پھیریں۔ وہ بازو جس کے اُوپر وریدوں کی دُھندلی شاخیں تھیں۔

''یہ پتھر کا نظامِ گردش ہے۔'' برٹل نے ایوا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو ایوا کی مسکراتی ہوئی آنکھوں کی دھوپ تیز ہو گئی۔

برٹل نے تحسین کی آنکھوں کو غور سے دیکھا۔ آنکھیں پھیلائیں۔ ماتھے پر بل ڈالے۔ سر کو خفیف جھٹکوں سے ہلایا۔ یہ تحسین کے لیے خاموش تعریف تھی جسے تحسین نے مسکراہٹ کے ساتھ قبول کرتے ہوئے برٹل کے کاندھے پر اپنی ہتھیلی رکھی۔

''مثالی شاہکار ہے۔'' ایوا نے کہا تو تحسین نے شکریہ ادا کیا۔

اگلی صبح تحسین ناشتے پر دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر کار اُٹھا اور ان کے دروازے پر دستک دی۔

''آ جاؤ'' اندر سے دنوں نے بیک آواز کہا۔

تحسین بیڈروم میں داخل ہوا تو برٹل ہاتھوں کی پوروں سے بستر کی سلوٹیں برابر کر رہا تھا۔

''ناشتہ کر لو۔ بیڈروم ٹھیک ہو جائے گا۔'' تحسین نے کہا۔

''یہ روز صبح اپنے بستر کی شکنیں چُنتا ہے۔ اس کی عادت ہے۔'' ایوا نے کہا۔

''دراصل میں فیثا غورث کے اقوالِ زریں پر عمل کرتا ہوں۔ فیثا غورث نے

فرمایا کہ جب بھی تم سو کر اٹھو تو بستر کی چادر سے اپنے جسم کے نقوش مٹا دو۔ جب بھی پکا کر برتن آگ کے اوپر سے ہٹاؤ تو راکھ پر اس کا نقش برابر کر دو۔

گری ہوئی چیز مت اُٹھاؤ۔

روٹی کو مت توڑو۔

سفید کوے کو مت چھوؤ۔

صلیب پر مت کھڑے ہو۔

شاہراہوں پر مت چلو۔

دہکتی ہوئی آگ کو لوہے کی سلاخ سے مت ہلاؤ۔

کھانے میں دل مت کھاؤ۔

میں صرف پہلی ہدایت پر عمل کرتا ہوں۔ اگر میں اپنا بستر برابر نہ کروں تو محسوس ہوتا ہے جیسے میرا کچھ حصہ بستر میں رہ گیا ہے۔'' برٹل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بستر برابر کرنے کے بعد ہاتھ اپنے جسم پر پھیر لیا کرو تاکہ تمھارا جسم دوبارہ مکمل ہو جائے۔''

تحسین نے مشورہ دیا تو ایوا بے اختیار ہنسنے لگی۔ برٹل ناشتہ کرنے کے لیے جلدی سے باہر نکلا۔

ناشتے کے بعد ے تینوں موہڑہ مرادو کے کھنڈرات کی سیر کر رہے تھے۔ سر بُریدہ سٹوپا کے سامنے برٹل رُکا اور بولا۔

''یہاں کتنا سکون ہے''

اس بات پر تحسین کو اپنے دادا یاد آئے۔ جن کے بارے میں تحسین کے والد نے بتایا تھا کہ عین اس جگہ انھوں نے نیند دریافت کی تھی اور سالوں کی بے خوابی کو نیند سے بجھایا تھا۔

کھنڈروں میں گھومتے ہوئے برٹل نے بتایا کہ اکیسویں صدی کی پہلی نیو ائیر نائٹ کے ۔ٹو پہاڑ پر منانے کا پروگرام ہے جس میں تحسین کی شرکت ضروری ہے۔

''یعنی پرسوں ہم تینوں نئ صدی کا استقبال کرنے کے۔ٹو پر جا رہے ہیں؟''

تحسین نے خوشی سے پوچھا۔

''ہاں'' دونوں نے بیک زبان کہا۔اکتیس دسمبر کی سہ پہر کو نیو ائیر نائٹ کی تیاری کی گئی۔ ایک میز، تین فولڈنگ کرسیاں، کھانے پینے کا سامان اور چند دیگر ضروریات کی چیزیں جہاز میں رکھی گئیں۔

رات کے آٹھ بجے جہاز سٹاٹ ہوا۔ جب تحسین جہاز میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ چار آدمیوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا اس طرح کہ دو دو لوگ آمنے سامنے بیٹھ سکتے تھے۔ ان سیٹوں سے ذرا آگے سامان رکھنے کی جگہ تھی اور آخر میں واش روم تھا۔ جہاز مکمل طور پر خود کار تھا۔ برٹل نے جہاز کے ایک میٹر پر ہدایات کے بٹن دبائے۔عرض بلد 35 درجے 53 منٹ شمال، طول بلد 76 درجے 31 منٹ مشرق۔۔۔ بلندی 8615 میٹر۔ برٹل نے جہاز کی بلندی کے۔ٹو کی 8611 میٹر کی بلندی سے ذرا بلند رکھی تھی۔ ریموٹ کے کچھ بٹن دبانے سے جہاز آہستہ آہستہ بلند ہوا اور شمال مشرق کی طرف اُڑنے لگا۔ کچھ دیر میں زمین پر روشنیوں کے جزیرے دھبوں میں بدلے اور پھر جہاز کے اندر جلنے والی دھیمی روشنی نے بتایا کہ باہر اماوس کی گھپ رات ہے۔ایک طرف تحسین اور ایوا بیٹھے ہوئے تھے اور اُن کے سامنے برٹل تھا جس کی گول عینک کے شیشوں پر روشنی کی ہلکی سی لرزش تھی۔ حالانکہ طیارے میں روشنی کا رخ اس کے چہرے کی جانب نہیں تھا۔کبھی سویڈن اور کبھی ٹیکسلا کی باتیں ہوئی تھیں۔ باتوں باتوں میں جہاز کی مدہم گونج اور ہلکی ہوئی۔تینوں نے شب بین چشمے لگائے اور شیشے سے باہر دیکھا۔ جہاز کے۔ٹو کی چوٹی سے چار میٹر اوپر ہوا میں معلق تھا۔شب بین چشموں نے اماوس کی سیاہ رات کو ابر آلود دن میں بدل دیا تھا۔ برف پوش

چوٹی سے سفیدی پھسل کر تا حدِ نظر پھیلے ہوئے برف کے سمندر میں گر رہی تھی اور کہیں کہیں سیاہ دھبوں کی شکل میں پتھروں کی عریانی تھی۔ تینوں کچھ دیر طلمسی دنیا کی لق و دق سیمابی دیکھتے رہے۔ برٹل نے طیارے کا رخ کنکارڈیا کی طرف موڑا جو پانچ گلیشیرز کا سنگم تھا۔ بالتورو اور گورڈن آسٹن گلیشیر کے ارد گرد دنیا کی آٹھ بلند ترین چوٹیاں ٹیلوں کی شکل میں نظر آ رہی تھیں۔ برف کی بنی بنائی عمارتیں تھیں۔ جن کی چوٹیوں پر نوکیلے سیمیں کلس، سنگِ سماق اور ابرق کے دانوں سے جُڑے ہوئے گنبد، دودھیا مینار اور سرمئی محرابیں تھیں۔ سطحِ برف پر لکیروں کا عمل شائبہ دیتا تھا جیسے کوئی برفیلا سمندر چاند کو چھونے کی کوشش میں اچھل کر پتھرا گیا ہو۔ کے۔ٹو کے دامن میں دھیرے دھیرے اُترتے ہوئے انھوں نے آٹھ چوٹیوں کے مزاجوں کا تنوع دیکھا۔ براڈ پیک کا شگاف دار گنبد ایک زاویے سے عقاب کی چونچ سے مشابہ تھا۔ ایک چوٹی کیشر برم چہارم تھی جس کی ایک عریاں سطح پر گلابی پتھر کی شریان لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے قریب بالتورو کنگری کا سنہری تخت تھا جس پر براجمان یخ بستگی کا سکوت فرمانروائی کرتا تھا۔ متر چوٹی دو حصوں میں منقسم تھی۔ ماربل پیک بتاتی تھی کہ یہ گورڈن آسٹن اور بالتورو گلیشیر کا سنگم ہے۔ اینجل پیک تھی جو کے۔ٹو کے جسم کا حصہ محسوس ہوتی تھی۔ قریب ہی کرسٹل پیک کی اُٹھان اور پھر ہِڈن پیل تھی جو اپنے نام کے برعکس نہایت واضح تھی۔۔۔ جہاز آہستہ آہستہ دامن میں اُتر رہا تھا۔ تینوں کے مشورے پر جہاز ایسے مقام پر معلق ہو گیا جہاں منظر حسین ترین تھا۔ یوں کہ سب چوٹیاں وضاحت سے نظر آتی تھیں۔ منظر کا تقاضا تھا کہ نظارہ تمام تر جمالیاتی عریانی کے ساتھ برفیلے طلسم کی پرتیں کھولے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے برٹل نے ہاتھ میں ایک ریموٹ پکڑا اور ایک مختصر سے غیبی کمرے کی تعمیر میں مصروف ہو گیا۔

نظر نہ آنے والا یہ کمرہ نیوا ایئر نائٹ کے لیے خصوصی طور پر تیار ہو رہا تھا۔ اس کی لمبائی تین میٹر جب کہ چوڑائی اور اونچائی ڈھائی میٹر تھی۔ یہ کمرہ اینٹی گیس شعاعوں کے

اخراج سے زیرِ تعمیر تھا۔ فضا میں موجود گیسوں، دباؤ اور درجہ حرارت کو معدوم کر کے ایک نقطہ وجود میں آیا تھا جو پھیلتے پھیلتے تین میٹر لمبا جبکہ ڈھائی میٹر چوڑا اور اتنا ہی اونچا ہو گیا تھا۔ اس اَن دیکھے بلبلے کے اندر مکمل خلا تھا۔ برٹل نے چھت کے قریب روزن بنا کر ایک نظر نہ آنے والا کنٹرول نصب کر دیا۔ جو بلبلے یا کمرے کے اندر کے ماحول کو ایک معتدل آب و ہوا دے رہا تھا۔ یعنی ماحول سے نائٹروجن، آکسیجن، آرگون اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کی آرام دہ مقدار کمرے میں مسلسل دستیاب ہو رہی تھی۔ برٹل نے آکسیجن کی مقدار %21 کی بجائے %17 فیصد کر رکھی تھی تاکہ پہاڑی علاقے کا ذائقہ جسم میں اُتر سکے۔ اسی طرح ہوا کا دباؤ 76 سینٹی میٹر مرکری کی بجائے 60 سینٹی میٹر رکھا تھا کہ ماحول کے اُتھلے پن کا شائبہ ہو سکے۔۔۔ کمرے کا غیبی فرش کشش ثقل کے اصول کے خلاف کام کرتا تھا یعنی زمین کا وہ حصہ جو غیبی کمرے کے نیچے تھا اپنی مائیت تبدیل کرتا تھا۔ خطہ زمین کے تمام ذرے الیکٹرانوں کے مداروں میں خفی ردو بدل کرتے تھے اور غیبی کمرے کے فرش پر کششِ ثقل کی گرفت کو تبدیل کرتے تھے۔ اس طرح یہ کمرہ مسلسل ہوا میں تیرتے ہوئے سفر کر سکتا تھا۔

کمرہ جہاز کے دروازے کے ساتھ چسپاں تھا۔ جہاز کا دروازہ گویا غیبی کمرے میں کھلا، ایوا اور تحسین نے جہاز سے میز نکال کر کمرے کے فرش پر رکھا۔ فولڈنگ کرسیاں میز کے گرد ترتیب دی گئیں۔ میز پر سرخ وائن کی بوتلیں، وائن گلاسز اور خانپور کے مالٹے سجائے گئے۔ کونے میں ایک ٹوکری رکھی گئی جس میں چکن چرغہ، نان اور سلاد تھا۔ ٹوکری کے ساتھ ہی ایک مائیکرو ویو اوون رکھا گیا کہ بوقت ضرورت کام آئے۔ اب تینوں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ برٹل کے ایک ہاتھ میں ریموٹ اور دوسرے میں چھڑی تھی۔ اُس نے ایک بٹن دبایا۔ کمرہ جہاز سے جدا ہوا اور ساتھ ہی جہاز کا دروازہ بند ہو گیا۔ جہاز کے کچھ فاصلے پر جا کر کمرہ رُک گیا۔ اب تینوں گویا ہوا میں معلق بیٹھے تھے اور کھلے منظر کے بے حجابانہ بے دریغی

کو شب بین چشمے لگائے دیکھ رہے تھے۔۔۔ایوا نے مئے ناب کی بوتل کا کارک کھولا اور ریڈ وائن کو کچھ دیر کے لیے کھلے منہ میز پر رکھ دیا۔کمرے میں وائن کی بھاری اور میٹھی خوشبو پھیلی۔خوشبو کے کنارے پر ترشی جھلملا رہی تھی۔وائن کی کھلی ہوئی بوتل کچھ دیر کمرے میں سانس لیتی رہی۔جب کمرہ مہکنے لگا تو ایوا نے تین گلاسوں میں آبِ احمریں انڈیلا۔بوتل سے نکلتی ہوئی شراب نے جب شیشے کی گردن میں دھڑکتے ہوئے جھٹکوں کی آواز اٹھائی تو تحسین کو احساس ہوا کہ اس آواز کا نام قُلقل ٹھیک رکھا گیا ہے۔جب ایوا نے جام تحسین کی طرف بڑھایا تو اس کی انگلیاں جام سے لپٹی ہوئی تھیں اور شیشہ پوروں کی افزونی کرتا تھا۔ تینوں نے ہاتھ بلند کر کے شیشہ اٹھایا۔

''برٹل کے نام۔'' ایوا نے جامِ جاناں تجویز کیا۔

''بے کراں طلسماتی ماحول کے نام۔'' تحسین نے پہلے برٹل، ایوا اور پھر کے۔ٹو کی چوٹی کو دیکھا۔

''حسینہ عالم کے نام'' برٹل نے کہا تو ایو بے اختیار شرمائی یوں کہ مئے ناب نے اُس کے رخساروں کو گلنار کیا۔۔۔کمرہ آہستہ آہستہ فضا میں آوارہ گردی کر رہا تھا اور تینوں آب و ہوائے رامش و رنگ میں تیر رہے تھے۔برف نگر میں چاندی راج کر رہی تھی۔ برفیلی شبیہیں بنتی اور بکھرتی تھیں۔سفید پس منظر میں بھرے ہوئے گلاس گہرے عنابی نظر آتے تھے۔تحسین نے شب بین آنکھوں سے اُتاری تو اسے یوں لگا جیسے وہ شدید اندھیرے میں ہوا میں معلق ہے۔اُس نے دوبارہ شب بین لگائی۔اب وہ دوبارہ ہر چیز کو وضاحت سے دیکھ سکتا تھا۔شراب اثر دکھا رہی تھی۔باتوں کے تسلسل میں دراڑیں پڑ رہی تھیں۔کہیں کہیں بے ربط باتوں کا تھپیڑا پڑتا تو بامعنی گفتگو اور لایعنیت کی دھند چھا جاتی، پھر قہقہوں کی کھنک جاگتی تو دھند چھٹ جاتی اور گفتگو کا تسلسل بحال ہو جاتا۔

''ہیپی نیو ائیر'' ایوا نے چیخ کر کہا اور نظریں کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی سے اُتار کر

برٹل کی آنکھوں میں رکھ دیں۔

''ہیپی نیو میلینئم''، برٹل ایوا سے لپٹ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی فرش پر گری تو اُس میں سبز لائٹ جلنے بجھنے لگی۔ اُس وقت وہ تینوں اس مقام سے گزر رہے تھے جہاں گورڈن آسٹن گلیشیر کی شاخ بالتورو سے نکلتی ہے۔ تحسین نے پہلی بار چھڑی سے سبز روشنی نکلتے ہوئے دیکھی، اس سے پہلے سرخ اور زرد لائٹ کبھی کبھی جھلملاتی تھی۔۔

''ہیپی نیو میلینئم''، برٹل اور ایوا تحسین سے گلے ملے۔

تحسین نے برٹل سے رنگ برنگی لائٹوں کی وضاحت چاہی تو برٹل نے اسے بتایا کہ سرخ لائٹ زمین میں دبے ہوئے معدنیات کا پتا دیتی ہے اور زرد لائٹ وہاں وہاں روشنی ہوتی ہے جہاں فوسل دبے ہوئے ہوں۔ زمین میں دبی ہوئی ان چیزوں کی تفصیلات مطلوب ہوں تو اسے ایک کمپیوٹر کا سہارا لیا جاتا ہے، جو ایک شعاع کے ذریعے زمین کے تہوں سے منسلک ہوکر اُن کی تمام جزئیات کو وضاحت سے دکھاتا ہے۔

''اور جو سبز لائٹ ابھی جلی تھی۔۔۔ وہ؟'' تحسین نے پوچھا۔

''کیا جلی تھی؟'' برٹل حیرانی بھری عجلت سے گلاس میز پر رکھا تو جام چھلک گیا۔

''ہاں چند منٹ پہلے'' تحسین نے برٹل کی حیرت کو حیرانی سے دیکھا۔

برٹل نے فوراً کمرے کا رُخ واپس موڑا اور کمرہ عین اُسی راستے پر واپس روانہ ہوا جہاں سے وہ آیا تھا۔ برٹل کی آنکھیں چھڑی کے دستے پر جمی ہوئی تھیں جبکہ تحسین اور ایوا کی برٹل پر۔ چند منٹ بعد چھڑی پر سبز لائٹ جلنے بجھنے لگی۔ برٹل نے کمرہ روک کر ہوا میں معلق کر دیا۔ اُس نے ایوا کو اشارے سے کونے میں پڑا ہوا ایک بیگ لانے کو کہا۔ اس دوران برٹل کی نظریں مسلسل ٹھہری ہوئی سبز لائٹ میں اُتری ہوئی تھیں۔ ایوا بیگ لے کر آئی تو برٹل نے ایک ریموٹ نما آلہ نکالا اور مختلف بٹن دبانے لگا۔ ایک سہ سمتی ہیولا ہوا میں نمودار ہوا جس کی دھند لائٹ کسی ٹھوس شے کی اَن جانی شبیہہ معلوم ہوتی تھی۔ برٹل مسلسل

اس دُھندلاہٹ کی ٹیوننگ کرتا گیا اور دیکھتے دیکھتے ایک انسانی شکل واضح ہوئی۔ ایوا اور تحسین دم بخود یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ برٹل نے کرسی سے ٹیک لگائی، سگریٹ سلگایا، مختلف بٹن دبانے سے وہ مجسمہ نما انسانی ہیولا ہوا میں پہلو بدلتا رہا، سر سے لے کر پاؤں تک ایک مکمل اور دلکش مجسمہ میز کے اوپر ہوا میں معلق تھا۔ میز پر دھرے ہوئے گلاسوں کی عنابی میں مجسمے کی نقرئی جھلملاتی تھی۔

''کیا میں زیادہ تو نہیں پی گیا، کیا تم لوگ بھی وہی دیکھ رہے ہو جو مجھے نظر آ رہا ہے۔۔۔؟'' برٹل نے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔ ''میں پتھر سے مورتی گھڑتا ہوں اور تم ہوا سے مجسمہ بناتے ہو۔'' تحسین نے کہا ''26.317 میٹر گہرائی میں برف کے اندر سے موجود ہے یہ شخص، ثابت وسالم۔ بظاہر بغیر کسی گھاؤ کے۔۔۔ مکمل طور پر جما ہوا۔۔۔ اے مجسمہ ساز مجھے بتا کیا یہ زندہ ہے؟؟؟'' برٹل نے سگریٹ کا دھواں چھوڑا تو شبیہہ ذرا سی دیر کو دُھندلا گئی۔

''اگر مرنے سے پہلے جم گیا ہے تو جم گیا ہے اور اگر جمنے سے پہلے مر گیا ہے تو مر گیا ہے!!!'' تحسین نے بے ساختہ کہا۔

''میرے خیال میں یہ مرنے سے پہلے جم گیا ہے۔ جمنے سے پہلے مرنے والوں کے خال وخدا اتنے زیادہ کیسے ہو سکتے ہیں؟'' ایوا نے یہ کہہ کر مجسمے کو ہاتھ لگایا تو اُس کی ہتھیلی دُھندلا گئی اور ریکھائیں غائب ہوگئیں۔

''ہیپی نیو میلینئیم'' تین گلاس ہوا میں بلند ہوئے۔ مئے لالہ فام میں چاندی کی جھلک اتری۔ ہوا میں لیٹا ہوا مجسمہ ذرا سی دیر کو تھرتھرایا اور پھر ساکن ہوگیا۔

''مائیکرو ویو میں کھانا گرم کیا گیا۔ کھانے کے دوران سرخ وائن کا دور جاری رہا۔ کھانا کھاتے ہوئے تینوں کی نظریں بار بار ہوا میں معلق مجسمے کی شبیہہ کی طرف اٹھتی تھیں۔

جب برتن سمیٹے جا رہے تھے تو برٹل برف میں جمے ہوئے شخص کے گردونواح کا

جائزہ لے رہا تھا اور مختلف تفصیلات اپنے لیپ ٹاپ میں محفوظ کر رہا تھا۔ برٹل اس سے پہلے بھی ایلپس اور ماؤنٹ ایورسٹ کے راستوں میں کئی جمے ہوئے جسموں کی دیکھ چکا تھا مگر وہ تمام مسخ شدہ حالت میں تھے اور برف کی کارفرمائی کے آگے سکڑی اور گلی سڑی بے بسی کا نمونہ تھے۔ زندگی کی رمق تو درکنار بعض اوقات یہ پہچاننا بھی دشورا تھا کہ وہ انسان تھے یا پتھر یا برف کے نقش و نگار جو انسانی جسموں کا شبہ دیتے تھے مگر اس بار برٹل نے دیکھا کہ کے۔ٹو کے دامن میں دریافت ہونے والا یہ شخص مکمل طور پر صحیح سلامت تھا۔ حیرت ناک بات یہ تھی کہ برف کا برتاؤ اس شخص کے ساتھ بہت مختلف اور دوستانہ تھا۔ جمے ہوئے جسم کے اردگرد بھری بھری اور روئی کے گالوں جیسی برف تھی۔ جمی ہوئی پتھریلی برف کی سختی جسم سے تقریباً ایک فٹ کے فاصلے سے شروع ہوتی تھی اور پھر تقریباً 26 میٹر تک بلند ہوتی ہوئی فضا کو چھوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی شخص دھنکی ہوئی برف کی نرمی میں دھنسا ہوا ہے اور اگر کروٹ بدلنا چاہے تو سرسراتا ہوا برفانی لحاف مزاحمت نہیں کرے گا۔ جلد کی رنگت گہری تھی مگر اس میں نیلاہٹ کی بجائے زردی مائل جھلک تھی۔ ناخنوں کے زرد رنگ میں کہیں کہیں گلابی دھبے تھے جیسے ناخن پر ناخن رکھ کر دبا دیا جائے تو گلابی رنگ کناروں پر چلا جاتا ہے۔ آنکھیں بند تھیں۔ پلکیں ملی ہوئی تھیں۔ آنکھ کے ڈھیلے دھنسے ہوئے نہیں تھے۔ اُن کا اُبھار مناسب اور قدرتی ساخت کا تھا اور بتاتا تھا کہ آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔ ہاتھوں کی انگلیاں خمیدہ ضرور تھی مگر بھینچی ہوئی نہیں تھیں یوں کہ انگلیوں کی پوریں ہتھیلیوں کو مس نہیں کرتی تھیں۔ پاؤں کی انگلیاں جوتے کی وجہ سے بھنچی ہوئی تھیں۔

جب برٹل نے جوتوں کے اندر جھانکا تو دیکھا کہ مسلسل بھینچے رہنے سے ایک لکیر پاؤں کے تلوں پر جمی ہوئی تھی۔ جسم کے اوپر فرغل کا رنگ سرمئی تھا جو کہیں گہرا اور کہیں ہلکا تھا۔ فرغل کا اصل رنگ نہ جانے کیا تھا۔ اردگرد کی نرم برف کہیں کہیں سے نارنجی تھی۔ شاید لباس کا رنگ برف نے چوس لیا تھا۔ کمر کے گرد بندھا ہوا بند قبا ایک ضخیم کمر بند تھا جس کا

پھندنا دائیں کولہے پر کسی ہوئی گرہ سے ذرا فاصلے پر جم گیا تھا۔ پھندنے کے ریشوں پر برف کی قلمیں تھیں۔ پشت پر لپٹے ہوئے شخص کو برٹل نے گھما کر دیکھا۔ پشت کے گرد لپٹے ہوئے فرغل کی شکنوں پر چمکیلی برف کی سفیدی تھی۔ کمر بند کے نیچے لباس زیادہ شکن آلود تھا۔ سر کی پُشت پر بال چپکے ہوئے تھے جن کے اوپر جما ہوا برفیلا شیشہ تھا۔ البتہ پیشانی پر بالوں کی لٹیں اُٹھ کر برفیلی فضا میں معلق ہوگئی تھیں۔

رات کے ڈیڑھ بجے برٹل نے اپنا کمپیوٹر بند کیا۔ تینوں فضا میں تیرتے ہوئے واپس جہاز کی طرف چلے۔ جہاز کا دروازہ کھلا، سامان سمیٹا گیا، تمام چیزیں واپس رکھی گئیں۔

''اگر مرنے سے پہلے جم گیا ہے۔۔۔تو جم گیا ہے اور اگر جمنے سے پہلے مرگیا ہے تو مرگیا ہے۔ مگر چہرے کے جمے ہوئے تیور اور خال وخد کی سلامتی بتاتی ہے کہ جم گیا ہے!!!'' برٹل نے خودکلامی کی۔

تحسین نے دیکھا کہ جب سے جما ہوا شخص دریافت ہوا تھا برٹل نے سنجیدگی اختیار کر لی تھی۔ ٹیکسلا میں قیام کے دوران بھی برٹل سوچ میں رہتا تھا۔ جب برٹل اور ایوا واپس جانے کے لیے جہاز میں سوار ہو رہے تھے تو برٹل اچانک مڑا اور تحسین سے بولا۔

''میرا خیال ہے۔۔۔جم گیا ہے!!!''

''تمہارا خیال جم گیا ہے!'' تحسین نے الوداعی ہاتھ ہلاتے ہوئے برٹل سے کہا۔

''ہاں! مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں اپنا آپ اونچی برف میں چھوڑ آیا ہوں۔''

باب چہارم

دل آدھی دھڑکن میں تھا جب رکا تھا۔ دل کی شکل، پٹھوں کا تشنج اور ریشوں کی بُنت بتاتی تھی کہ بہت سال پہلے جب دل آدھا بھنچا ہوا تھا تو برف نے دل کا درجہ حرارت نقطہ انجماد سے نیچے گرا دیا تھا۔ یوں کہ دل آدھی دھڑکن میں پتھرا گیا تھا۔ وہ خون جو دل کی آدھی دھڑکن نے نظام گردش میں دھکیلا تھا شریانوں میں پتھرا گیا تھا اور پھر چند ہی لمحوں بعد شریانیں اور وریدیں دھات کی یخ بستہ نالیاں بن گئیں تھیں جن کے اندر شاخ در شاخ خون کا سنگِ شجر تھا۔ دل سے پھوٹی ہوئی شریانِ کبیر شہ رگ تک پھولی ہوئی تھی اور جسامت میں ان وریدوں سے بڑی تھی جو دل کے اندر جسم کا خون اتارتی تھیں۔ دماغ برف کا ڈلا تھا اور اس کی بیرونی سطح کے نشیب و فراز واضح تھے۔ برف کے شیشے میں دماغ کی لکیریں جمی ہوئی تھیں۔ دماغ کے دونوں حصوں کے درمیان ایک گہری ریکھا کی گھنیری حد بندی تھی۔ برٹل کے لیے یہ بات حیرت کا باعث تھی کہ دماغ کا وہ حصہ جسے پِن ییل باڈی کہتے ہیں غیر معمولی حد تک بڑا تھا۔ برٹل مسکرایا اسے ڈیکارٹ یاد آیا۔ جس کے مطابق دماغ کا یہ حصہ

روح کی آماجگاہ ہوتا ہے۔شاید اس لیے کہ یہ دماغ کے عین درمیان میں واقع ہونے کے سبب تنہا و یکتا اور جداگانہ وحدت رکھتا ہے۔وگرنہ دماغ کا ہر حصہ جو ایک نصف کُرّہ دماغ میں ہوتا ہے دوسرے کُرّے میں بھی پایا جاتا ہے۔پِن یل باڈی بچوں اور جانوروں میں بڑی ہوتی ہے اور جوں جوں عمر گزرتی ہے سکڑتی جاتی ہیں اور اس میں ریت بھرتی جاتی ہے۔مگر برٹل نے دیکھا کہ اس میں دماغی ریت کی بجائے برفیلی ریت کے ذرے چمک رہے تھے۔ برٹل نے تمام اعضائے رئیسہ کا جائزہ لیا جو منجمد جسم کے اندر جمے ہوئے تھے اور اپنی جگہ پر مکمل تھے۔

جمے ہوئے شخص کے سینکڑوں عکس باریک اور دقیق جزئیاتی تفصیلات کے ساتھ برٹل کے کمپیوٹر میں محفوظ تھے۔سویڈن واپس آنے کے بعد وہ دن میں کئی گھنٹے ان کا تفصیلی معائنہ کرتا تھا۔جما ہوا شخص اس کے لیے ایک پراجیکٹ کی حیثیت رکھتا تھا جسے وہ مثبت،رجائیت پسند اور امید پرور انداز میں پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا۔اس پراجیکٹ کا پہلا مرحلہ شروع ہو چکا تھا یعنی منجمد جسم کی زیادہ سے زیادہ تفصیلات سے آگاہی۔اب تک رونما ہونے والے اکثر و بیشتر انکشافات پراجیکٹ کی کامیابی کے حق میں تھے۔کہیں کہیں یہ گمان ہوتا تھا کہ جسم کے کچھ حصے برف کے جبر اور اندوہناک درجۂ حرارت کی جارحیت کا شکار ہوئے تھے مگر مزید چھان بین سے شائبہ گزرتا کہ امید کی کرن موجود تھی جو جسم کے رگ وریشے پر برف کا شیشہ چمکا رہی تھی۔

برٹل نے سانس کو دیکھا۔۔۔جو کُہر کی شکل میں پھیپھڑوں کے اندرونی نشیب و فراز سے لے کر نرخرے تک پھلی ہوئی تھی۔زبان کے گرد جمے ہوئے لعاب دہن کو دیکھا جو نچلے دانتوں میں فروانی کرتا تھا اور بڑھتا ہوا گلے میں معلق سانس کے کہرے میں غائب ہو جاتا تھا۔یہ وہ سانس تھی جو سال ہا سال پہلے جسم نے آخری بار فضا سے کھینچی اور پھر ساکت ہو گئی۔

دماغ کی اساس میں واقع پچوٹری گلینڈ اپنے ہارمون سمیت منجمد تھا۔گردوں کے بالائی غدود درست حالت میں تھے اوران کے اندر یخ رطوبتیں تھیں۔تناسلی غدودوں میں مادہ تولید کی چمکتی ہوئی لہریا لکیریں تھی۔کھوپڑی کی اساس سے نکلنے والی ریڑھ کی ہڈی کی زنجیر مہرہ درمہرہ سلامت تھی اور کولھوں کے درمیان اپنے قدرتی مخروطی انجام کو پہنچتی تھی۔کھوپڑی کے مغز سے نکلنے والی نالی حرام مغز کے درمیان چلتی ہوئی کولھوں تک جاتی تھی اوراس کے اندر کا سیال شفاف کانچ کی طرح جھلملاتا تھا۔جگر مناسب پھیلاؤ میں تھا جس کی عقبی دیوار سے پتے کا ابھار جھلکتا تھا۔جب برٹل کی نظریں پتے کے افزودہ عکس میں اتریں تو اس نے دیکھا کہ اندر پتے کا پانی تھا۔جما ہوا شخص نہایت مضبوط جسم اور اعصاب کا مالک معلوم ہوتا تھا کیونکہ انتہائی یخ بستگی نے بھی اس کا پتہ پانی نہیں کیا تھا۔جگرداری کا یہ عالم تھا کہ نظامِ گردش، نظامِ انہضام، نظامِ اعصاب اوراعضائے رئیسہ کے تمام عکس غمازی کرتے تھے کہ شکست وریخت کا اندوہناک عمل شروع ہونے سے بہت پہلے برف نے کام کردیا اور جسم کو انتہائی سرعت کے ساتھ نقرئی حنوط میں لپیٹ کر جامد کردیا تھا۔

برف کا رویہ اس شخص کے ساتھ انتہائی جانبدارانہ معلوم تھا۔برف ہر انداز اور طریقے سے کارفرما تھی۔سخت چمکدار شیشہ،کرخت اور چٹخا ہوکانچ،بُھر بُھرا اور دھندلا ہیولا،پھیلی ہوئی دھند،اندھا کہرا،بینا اور نابینا برف کی قلمیں،چمپئی نقش ونگار،رطوبتوں کی دراڑیں،کھائی ہوئی ڈلیاں،بافتوں کی بُنت سے جھانکتے ہوئے بلوریں موتی اور نگ،جمی ہوئی مختصر چادروں کے ٹوٹے ہوئے کناروں پر چمکتی ہوئی جھالریں۔۔۔غرضیکہ برف کی پہلودار اور فعال کارروائی اتنی سرگرمی کے ساتھ فعال ہوئی تھی کہ جسم کی گرمی کا کہرا تک جمے ہوئے جسم کے اوپر تیر کر دھند میں تبدیل ہوگیا تھا۔۔۔جسم کے اوپر کاسۂ سر تھا جس کے اندر جمے ہوئے دماغ کا ڈھیلا تھا۔جس میں جمی ہوئی اربوں کھربوں نسوں کا آرکیسٹرا انجماد میں تھا اور وہ سمفنی خاموش تھی جو دل کی دھڑکتی ہوئی تال پر حرکت کا نغمہ پیش کرتی ہے۔کیا یہ

سمفنی دوبارہ سنسنائے گی؟ کیا یہ ممکن ہے؟

برٹل انتہائی پریکٹیکل انسان ہونے کے سبب نہایت ٹھنڈے مزاج کے ساتھ اپنے پراجیکٹ پر عمل پیرا تھا۔ وہ اپنی دریافت کو کئی پہلوؤں سے دیکھتا تھا۔ اوّل تو یہ دریافت ہی اتنی نایاب تھی کہ فقط اس کا انکشاف ورطۂ حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی تھا۔ پھر اس شخص کا لباس اور جوتے دیکھنے والی آنکھوں کے لیے ایک نادر نمونے کا درجہ رکھتے تھے۔۔۔ اگر اس شخص کا ایک خلیہ بھی حاصل کرلیا جائے تو کلوننگ کے کام آ سکتا تھا۔ اس شخص کے جسم پر تحقیق کرنے کے بعد بہت سے حیاتیاتی انکشافات متوقع تھے۔ اس شخص کو حنوط کر کے دنیا کے کسی عجائب گھر کی زینت کو چار چاند لگا سکتے تھے۔۔۔ پراجیکٹ کا سب سے اہم اور رجائیت پسندی سے بھرپور مرحلہ ایک کوشش تھی کہ شاید۔۔۔ شاید اس شخص کو برف کی دست برد سے آزاد کرنے کے بعد اربوں کھربوں نسوں کی سمفنی کو دوبارہ تھرتھراہٹ میں لایا جا سکے اور جمے ہوئے وقت کی برفیلی حقیقت پر خطِ تنسیخ کھینچ کر زندگی کی لکیر کو یوں جاری کیا جا سکے کہ قدیم اور جدید زندگی کے درمیان حد فاصل مٹ جائے اور وقت کا انجماد قلم زد ہوجائے۔۔۔ منہا ہوجائے۔۔۔ منسوخ ہوجائے۔ کیا وقت کا جبر اس دخل در معقولات کی اجازت دے گا؟ کیا برف کا جما ہوا شکنجہ زندگی کے گرد کسی ہوئی منجمد انگلیوں کی گرفت ڈھیلی کرے گا؟ اگر نہیں کرے گا تو اتنے اہتمام کے ساتھ اسے منجمد کیوں کیا گیا؟ کیا برف نے تعمیری تخریب کی تھی یا تخریبی تعمیر؟

برٹل کو تحسین یاد آیا۔ جب یہ شخص دریافت ہوا تو تحسین کے ایک ہاتھ میں وائن کا گلاس اور دوسرے میں سگریٹ تھا۔ تحسین نے کہا تھا:

''میرے ایک ہاتھ میں رزق اور دوسرے میں انگارہ ہے۔ اگر یہ شخص جمنے سے پہلے مر گیا ہے۔۔۔ تو مر گیا ہے اور اگر مرنے سے پہلے جم گیا ہے۔۔۔ تو جم گیا ہے۔''

فرغل کے بندِ قبا کے ساتھ تین پوٹلیاں ضخیم رسیوں کے سہارے بندھی ہوئی

تھیں۔ایک پانی کی چھاگل تھی جو کھال سے بنی ہوئی تھی اور اس کے اندر پانی جما ہوا تھا۔آدھی چھاگل خالی تھی۔جمی ہوئی سطح آب کے اوپر منجمد لہریں تھیں۔دوسری پوٹلی میں بے ہیئت معدنی سفوف تھا جو مٹی کی طرح معلوم ہوتا تھا۔تیسری پوٹلی میں خشک فروٹ تھا۔خشک خوبانی،انجیر،کشمکش،بادام اور اخروٹ تھے۔برٹل کی نظریں جب ان پھلوں میں اتریں تو اس نے خوبانی کی گٹھلیاں اور ان میں چھپے ہوئے بادام نما مغز دیکھے۔اخروٹ کے سخت چھلکے اپنے اندر دماغ نما گریوں کو چھپائے ہوئے تھے۔پانی کی چھاگل اور خشک فروٹ تو سمجھ میں آتا تھا البتہ مٹی کی پوٹلی ایک معمہ تھی۔

لباس اور جوتوں سے یہ شخص برصغیر کا باشندہ معلوم ہوتا تھا۔لمبے فرغل کے نیچے اونی قمیص اور پاجامہ تھا جو جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔مگر یہ لباس گزشتہ تقریباً ایک صدی سے پہلے کا معلوم ہوتا تھا البتہ اس مرحلے پر وقت کا تعین دشوار تھا۔کھال کے بھاری بوٹوں پر چرمی تسمے تھے۔جوتے لمبے تھے اور قریب قریب پنڈلیوں تک پہنچتے تھے۔جرابوں کی جگہ چرمی موزے تھے جو نرم کھال سے بنے ہوئے تھے اگرچہ لباس اس شخص کے مقامی ہونے کا شبہ دیتا تھا مگر وضع قطع اور خال وخد بدیسی تھے۔جلد کی رنگت گہری تھی۔عین ممکن ہے کہ برف کے لمس نے جلد کی رنگت تبدیل کر دی کیونکہ لمس کا تسلسل اپنا رنگ بھی چھوڑتا ہے اور خال وخد میں تغیر بھی لاتا ہے۔لمس جسم کو اپنے رنگ میں رنگنے کی پیہم کوشش کرتا ہے۔خواہ یہ لمس رفیقِ حیات کا ہو یا برف کا۔برٹل نے سوچا اور محتاط اندازہ لگایا کہ جسم کم ازکم ایک صدی پرانا ضرور تھا۔برٹل رجائیت پسند ضرور تھا مگر پریکٹیکل ہونے کے سبب وہ خیال کی ایک جست لگا کر اس شخص کو قدیم قرار نہیں دے سکتا تھا۔اس کے لیے ثبوت درکار تھا۔جو اس مرحلے پر ممکن نہ تھا۔

ایوا نے برٹل کی پشت پر اپنے جسم کے خم کو چسپاں کیا۔بازو اس کی گردن میں ڈال کر بتایا کہ رات کے دو بج چکے ہیں۔برٹل نے اس کے بازو پکڑ کر جھولنا شروع کیا تو ہوا

میں معلق جمے ہوئے شخص کا سہ جہتی ہیولا اُس کی آنکھوں کے سامنے ہلنے لگا۔ برٹل نے گردن موڑ کر دیکھا ایوا کا چہرہ اس کی دائیں کاندھے پر مسکرا رہا تھا۔ برٹل نے ایوا کے ہونٹوں پر اپنے لبوں کی مہر لگائی تو ایوا نے بتایا کہ اس کا بوسہ سرد تھا۔ برٹل نے کہا کہ لمس کا تسلسل اپنا رنگ چھوڑتا ہے اور ان دنوں وہ جمے ہوئے شخص کے ساتھ جما ہوا ہے اس لیے اس کے ہونٹ سرد ہیں۔

———————

کے ٹو کے دامن میں پورن ماشی کی چاندنی برف سے ٹکرا کر منعکس ہو رہی تھی۔ چاندنی کی اتنی بہتات تھی کہ رات کو رات کہنا دشوار تھا۔ مارچ کے مہینے کی یہ رات دیکھ کر دن شرماتا تھا۔ پہاڑ پر برف اور برف پر خاموشی کا ٹھہراؤ تھا۔ جب برف پر پاؤں کا دباؤ چر چراتا تو قدم بھر چاندنی بھری برف سنسناہٹ کے ساتھ فضا میں اڑ کر تحلیل ہو جاتی تھی۔ جہاز فضا میں معلق تھا۔ زمین سے ایک میٹر بلند برٹل، ایوا اور تحسین برف پر کھڑے تھے۔ اس بار غیبی کمرہ تعمیر نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے وہ خاص طور پر بنائے گئے گرم ملبوسات پہنے ہوئے تھے۔ جن کا درجہ حرارت اور ہوا کا دباؤ ایک کنٹرول کے ذریعے معتدل رکھا گیا تھا۔ مرکز نگاہ گورڈن آسٹن گلیشیر کی وہ شاخ تھی جو بالتورو گلیشیر سے نکل کر فرازِ کوہ کی طرف لے جاتی تھی۔ برٹل شعاعوں کے ذریعے برف کاٹ رہا تھا۔ برف کا ایک ایک ٹیلہ بڑے بڑے پتھروں کی شکل میں کٹ کر ارد گرد کی برف پر پھیل رہا تھا۔ برف کو چھیلنے کا عمل جاری رہا۔ 25 میٹر گہری برف جب کٹ کٹ کر ادھر اُدھر بکھری تو اس مقام کا نقشہ ذرا تبدیل ہوا۔ مگر برف کو ایک جگہ ڈھیر کرنے کی بجائے ارد گرد پھیلایا جاتا رہا۔ تاکہ کٹاؤ کا عمل منظر زیادہ تبدیل نہ کرنے پائے۔ برف کے کٹاؤ کا عمل اب بہت محتاط ہو گیا تھا اور برف کے پتلے پتلے قتلے چھل چھل کر اتر رہے تھے۔ برٹل نے ساڑھے تین میٹر لمبا، ڈیڑھ میٹر چوڑا اور ڈیڑھ میٹر اونچا برف کا ٹکڑا کاٹا جو ہوا میں تیرتا ہوا اس صندوق میں آ کر ٹھہر گیا جس کا درجہ

حرارت منفی 40 ڈگری سینٹی گریڈ پر کنٹرول کیا گیا تھا۔صندوق ہوا میں اٹھا اور جہاز کی جانب تیرنے لگا۔ جہاز کا عقبی دروازہ ہوا میں بلند ہوا اور صندوق جہاز کے اندر داخل ہوگیا۔ عقبی دروازہ اپنے مقام پر واپس آ گیا۔ برف کا ٹکڑا کاٹ کر صندوق میں رکھنے تک اور پھر صندوق کے جہاز میں اترنے تک کل چالیس منٹ لگے۔۔۔ جما ہوا شخص اب گلیشیر کی بجائے صندوق میں منجمد تھا۔

جہاز کی پرواز کا رُخ جنوب کی طرف تھا۔بحیرۂ عرب پار کرنے کے بعد اب جہاز بحر ہند کے اوپر اڑ رہا تھا۔کراچی سے تقریباً اڑھائی ہزار کلو میٹر جنوب مشرق میں ایک بے آباد جزیرہ تھا۔ جب جہاز اس جزیرے میں اترا تو رات بھیگ چکی تھی۔

جما ہوا شخص کم ازکم ڈیڑھ سو سال کا پرانا تھا۔زیادہ بھی ہوسکتا تھا۔ ہزار سال، دو ہزار سال یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ چونکہ اگلا مرحلہ یعنی جمے ہوئے شخص کو زندہ کرنے کا مرحلہ نہایت حساس تھا اس لیے تمام انتظامات ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیے گئے تھے۔ یہ فرض کیا گیا تھا کہ منجمد شخص کسی قدیم ترین دور سے تعلق رکھتا تھا۔اگر وہ ہوش میں آ گیا تو کیا موجودہ زمینی آب و ہوا کے ساتھ رابطے کا تصادم برداشت کر لے گا؟ موجودہ آب و ہوا کی آلودگی اس پر اثر انداز ہونے سے گریز نہیں کرے گی۔اگر یہ شخص آلودہ آب و ہوا برداشت کر بھی گیا تو کیا اچانک جدید دور کی تبدیلی دیکھ کر ذہنی دھچکا سہہ جائے گا جس کا شاید اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہو؟ کیا اس کے حواسِ خمسہ اندوہناک شور اور فضا کی بو کو سہار سکیں گے جو قدیم دور سے بہت مختلف ہے؟ اوزن پرت میں رخنہ پڑنے سے زمین کے اردگرد کا مدافعتی فضائی چھلکا پھٹا ہوا ہے۔کیا شمسی شعاعوں کی براہ راست جارحیت اس شخص کو جلد کو معاف کر دے گی۔۔۔وہ جلد جو ایک عمر محفوظ شعاعوں میں نہائی رہی؟ آج کل کی سبزیوں اور پھلوں کے ہر رگ و ریشے میں کیمیاوی کھادوں کا سیال اور جینیاتی انجینئرنگ کی توڑ پھوڑ تیر رہی ہے۔کیا اس شخص کا نظام انہضام اس تبدیلی کو

برداشت کرلے گا؟ تیز تیز بولتے اور میکانکی عجلت میں چلتے پھرتے لوگ آج کی دنیا کے باسی ہیں۔کیااس شخص کی طبیعت کا ممکنہ ٹھہراؤ موجودہ دور کی تیزی کا صدمہ برداشت کرسکے گا؟ یہ وہ ممکنہ خطرات تھے جن سے بچاؤ کے لیےاقدامات کیے گئے تھے۔

بحرِ ہند میں واقع یہ تنہا اور بے آباد جزیرہ ابھی تک انسانی لمس سے ناآشنا تھا۔ چونکہ یہ خطہ زمین بحری جہازوں کی گزرگاہ نہیں تھا۔اردگرد کے ملکوں اور جزیروں سے محفوظ فاصلے پر تھاچنانچہ کسی بھی ملک کے لیے دفاعی اور وسائلی اعتبار سے پرکشش نہیں تھا۔شاید اس لیے دنیا کے نقشے پر صرف ایک نقطے کی صورت میں اپنے وجود کا احساس دلاتا تھا۔ دنیاکے نزدیک اس سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔اس جزیرے کی آب وہوا معتدل تھی۔زمین زرخیز تھی۔انواع واقسام کے درختوں اور جنگلی پھولوں کی بہتات تھی۔اوزون پرت کے گھاؤ سے نکلنے والی شعاعوں کی نقصان دہ عریانی اس جزیرے کی فضا سے گریز کرتی ہوئی اپنی قیامت خیز لہریں آسٹریلیااوراس کے قریب وجوار میں پھینکتی تھی۔دنیا کا شوروشر اپنی تمام تر آلودگی کے ساتھ ایک محفوظ فاصلے پر تھا۔رنگ برنگے پرندوں اورانواع واقسام کے جانوروں کی حکمرانی تھی۔سمندر کی نمکین نمیدہ دست درازی کا رخ بھی اس قطعۂ اراضی کی طرف نہیں تھا۔ہواؤں کا طرف دارانہ رویہ فضا میں نمی کا تناسب مناسب حدتک سازگار رکھتا تھا۔۔۔برٹل اورایوا کو یہ جزیرہ بہت پسند تھا۔وہ گزشتہ چند برسوں سے یہاں آتے اور دوتین دن قیام کرتے۔برٹل کو یہ علاقہ ایوا کے حسن کی طرح پرکشش اورطرح دارلگتا تھا۔ایک بارایوانے برٹل سے کہا تھا کہ اس جزیرے کا کوئی نام رکھا جائے تو برٹل نے شدید ردعمل کیا اور کہا تھا کہ اتنی خوبصورت جگہ کا کوئی نام نہ رکھا جائے تو اچھا ہے۔ایوانے اصرار کیا تو برٹل نے کہا تھا کہ اس جگہ کا نام ''جگہ'' رکھ دیا جائے۔

برٹل گزشتہ تین ماہ سے اس جزیرے پر مختلف کاموں کی نگرانی کررہا تھا۔لکڑی کے تختوں سے دوکمروں کا ایک گھر بنوایا گیا جس کا کوئی مخصوص فن تعمیر نہیں تھا۔ایسے گھر ہر

دور میں ہوا کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے گھروں میں اور ضرورت اور مجبوری کے تحت رہتے ہیں اور کچھ ایڈونچر اور تبدیلی آب وہوا کے لیے۔ یکسانیت توڑنے اور فطرت کے قریب تر ہونے کے لیے چوبی دیواریں، گھاس پھوس کی چھت، کچے فرش، بڑے بڑے پتھر جوڑ کر بنائے گئے۔ بچھائے گئے پلنگ، جن کے اوپر بچھائے گئے گدوں کے سوتی پارچوں کے اندر کپاس گٹھلیوں کی طرح ٹکڑا ٹکڑا سرسراتی ہے۔ دیوار کے ساتھ لٹکتے ہوئے اونی اور سوتی فرغل جن کے کالروں کا سمور دیوار میں پیوست موٹی میخوں کا سہارا لیتا ہے۔ مٹی کا چولہا، گھر کے باہر کنواں جس کی آہنی چرغی پر لپٹے ہوئے رسے کے دوسرے کنارے پر چرمی چھاگل لٹکتی ہے۔

جزیرے پر پھلوں کے درخت بہتات کرتے تھے۔ برٹل چاہتا تھا کہ یہاں ایسی سبزیاں اور فصلیں اُگائی جائیں جو قدرتی ہوں اور انسانی تجربات سے پاک ہوں۔ نہ ان کے بیجوں میں کھاد کا اثر ہو، اور نہ جینیاتی انجینئرنگ نے اس کی ہیئت بدلی ہو۔ اس سلسلے میں تحسین نے اس کی مدد کی۔ تحسین کا ایک دوست پاکستان میں صحرائے چولستان کے قریب رہتا تھا جہاں اس کی وسیع وعریض زمین تھی۔ وہ اپنی زمین میں کیمیائی کھاد استعمال نہیں کرتا تھا۔ نہ ہی اس کے آباؤ اجداد کرتے تھے۔ اس کے پالتو جانوروں کے ریوڑ تھے جن کی افزائش نسل باہر کا کوئی جانور نہیں کرتا تھا۔ اگرچہ وہاں فصلوں کی فی ایکٹر پیداوار باقی علاقوں کی نسبت کم تھی مگر یہ بات طے ہے کہ فصلیں خالص تھیں اور وہاں کے جانوروں کا گوشت اور دودھ بھی خالص تھا۔ فصلوں کے ایک طرف صحرائے چولستان ہے اور باقی جانب ویرانہ، اس لیے یہ خدشہ بھی نہیں تھا کہ اردگرد کی زمین سے کھاد کا اثر سرایت کر کے ان فصلوں کو آلودہ کر سکے۔ تحسین نے وہاں سے گیہوں، کپاس، مکئی، باجرہ اور سبزیوں کے خالص بیج لا کر برٹل کو دیئے۔ دودھ دینے والے چند جانور بھی خریدے گئے جن کی منہ مانگی قیمت دی گئی۔

''یہ تمام چیزیں خالصتاً خالص ہیں!''

''کیا؟'' برٹل نے حیرانی سے پوچھا۔

''خالصتاً خالص ہیں'' تحسین نے دہرایا تو برٹل نے تحسین کی طرف دیکھا۔ تحسین کے چہرے پر ایک مجسمے کا ٹھہراؤ تھا۔۔۔ ہزار رہا سال پرانے مجسمے کا ٹھہراؤ۔

جب تینوں جہاز سے اترے تو جزیرے پر معتدل موسم تھا۔ کے۔ٹو کے لیے بنایا گیا لباس انھوں نے جہاز ہی میں تبدیلی کر لیا تھا۔اب وہ ہلکے پھلکے کپڑوں میں تھے۔گھر میں داخل ہوئے تو برٹل نے کہا:

''اوہو، میں اپنے سگریٹ تو جہاز ہی میں بھول آیا۔۔۔ایوا، پلیز مجھے سگریٹ لادو۔''

برٹل تینوں کے بستر بنانے میں مشغول تھا۔

ایوا ٹھٹھک گئی اور بولی'' مجھے ڈر لگتا ہے۔ جہاز کے اندر جو صندوق ہے وہ مجھے تابوت کی طرح لگتا ہے۔میں اکیلی وہاں نہیں جاؤں گی۔۔۔''

صبح ہوئی تو تحسین گھر سے باہر نکلا۔اس نے دیکھا کہ جزیرہ نہایت دلکش اور سرسبز و شاداب ہے۔انواع واقسام کے درختوں میں زیتون کے پیڑوں کی کثرت ہے۔ فصلوں اور سبزیوں کے کھیتوں میں کچھ لوگ کام کر رہے ہیں۔انھوں نے جو لباس پہنے ہوتے تھے۔وہ وقت کی قید سے آزاد تھے اور جمے ہوئے شخص کے لباس سے مشابہ تھے۔ جہاز ہموار زمین پر کھڑا ہوا تھا۔ جہاز سے ذرا فاصلے پر ایک جہاز نما لوہے کا مخروطی ڈھانچہ تھا۔ یہ برٹل کی موبائل لیبارٹری تھی جس کے اندر جمے ہوئے شخص کو برف سے آزاد کرنے کا عمل ہونا تھا۔ یہ لیبارٹری تمام ضروری ساز وسامان سے لیس تھی۔تحسین ان سرسبز پہاڑوں کی طرف چلنے لگا جو نہایت شفاف اور نیل بھرے آسمان کے نیچے ہریالی کا شاندار تضاد دیتی تھیں۔ پہاڑیوں کا قد درمیانہ تھا۔ پہاڑیوں میں چلتے چلتے تحسین نے دیکھا کہ آسمانی رنگ

کی چمکدار جھیل ٹھہراؤ میں تھی۔ جیسا کہ جھیلیں صبح کے وقت ہوا کرتی ہیں۔ جھیل کا ایک کنارہ آسمان کو مس کرتا تھا۔ پانی کا یہ ٹکڑا آسمان کا حصہ معلوم ہوا تھا، تحسین کو یوں لگا جیسے ذرا سا آسمان ٹوٹ کر زمین پر گر گیا ہے۔ پہاڑیوں پر صنوبر کے درختوں کے جُھنڈ تھے۔

تحسین نے ایک پتھر جھیل میں پھینکا تو زمین پر دھرا ہوا آسمان لہر زدہ ہو کر تھرتھرانے لگا۔ ایک درخت کے جھنڈ سے پرندوں کی ڈار چہچہاہٹ میں حیرت بھر کر اڑی۔ اُن کے رنگ رنگ کے رنگ تھے۔ وہ نیچی پرواز میں اڑتے تھے اور بعض اوقات اپنے پروں کو پانی کی سطح سے مس کرتے تھے۔ زیتون کے ایک درخت سے ایک کوہی ابابیل تیر کی طرح نکلی اور آسمان میں غائب ہوگئی۔ جھیل میں رنگ دار مچھلیاں تھیں۔ جو کوئے مچھلیوں سے ملتی جلتی تھیں۔ تحسین نے ایسی مچھلیاں چین اور سنگاپور میں دیکھی تھیں۔ تحسین کو یہ مچھلیاں بہت پسند تھیں کیونکہ ایک تو یہ مچھلیاں آبی دنیائے رنگ وحسن کی کاملیت کا شاہکار تھیں اور دوسرا یہ پانی کے بہاؤ کے مخالف سفر کرنے کا سبب چینی لوک داستانوں کا حصہ تھیں۔ مگر یہ مچھلیاں اس جزیرے میں کیسے آگئیں۔ شاید دنیا کے شور وشر سے کنارہ کر کے پرسکون گوشہ نشینی انھیں یہاں کھینچ لائی تھی۔ تحسین یہ سوچ کر مسکرایا۔ تحسین واپس گھر کی طرف آرہا تھا۔ راستے میں اُسے مختلف لوگ آتے جاتے ملے۔ ہیلو۔ گڈ مارننگ۔ کیا خوبصورت دن ہے۔۔۔ یہ لوگ اس سے زیادہ گفتگو نہیں کرتے تھے اور پیشہ ورانہ عجلت میں معلوم ہوتے تھے۔ یہ عورتیں اور مرد ہر عمر کے تھے۔ ایک نہایت حسین لڑکی تحسین کے قریب سے گزری تو اس نے تحسین سے کہا۔ بہت خوبصورت دن ہے۔ تحسین نے بے ساختہ کہا۔ ''تمہارے جیسا ہے۔'' یہ سن کر لڑکی والہانہ ہنسی اور بولی۔ آپ کا ناشتے پر انتظار ہو رہا ہے۔

ناشتے میں تحسین نے برٹل اور ایوا کو بتایا کہ جزیرے پر صبح کی سیر نہایت پر مسرت تجربہ تھا۔ برٹل نہایت سنجیدہ تھا۔ چائے کا ایک گھونٹ بھر کر جب برٹل نے سگریٹ سلگایا تو ان چھوٹی فضا نے دھوئیں کو بہت گہرا دکھایا۔ تحسین نے سگریٹ کا اتنا گہرا دھواں پہلے کبھی

نہیں دیکھا تھا۔ یہ دھواں سلیٹی مائل نیلگوں رنگ کا تھا۔سگریٹ کی راکھ ایک دو بار بے اختیار نیچے گری کیونکہ سگریٹ بڑی تیزی کے ساتھ راکھ میں تبدیل ہور ہا تھا۔

''آج کا دن نہایت اہم ہے۔آج معلوم ہو جائے گا کہ جما ہوا شخص مرنے سے پہلے جم گیا تھا یا جمنے سے پہلے۔۔۔اگر یہ زندہ ہو گیا تو پراجیکٹ سو فیصد کامیاب ہے۔اگر زندہ نہ بھی ہوا تو محنت اکارت نہیں جائے گی۔اس جزیرے میں خالص فصلیں اُگا کریں گی اور خالص جانور فزائش کریں گے۔ہم یہاں آکر کبھی کبھار رہا کریں گے۔وقت کی قید سے آزاد کپڑے پہنیں گے۔مزے مزے کے کھانے کھائیں گے۔ٹیلیفون بند رکھیں گے۔ٹیلی ویژن سے پرہیز کریں گے۔گھڑی دیکھنے سے اجتناب کریں گے۔۔۔کتنی رومانٹک بات ہے۔'' برٹل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ایوا جواباً مسکرائی۔مگر تحسین نے دیکھا کہ برٹل کی مسکراہٹ کے پیچھے سنجیدگی کا گہرا سایہ تھا اور وہ ذہنی طور پر اس عمل کا آغاز کرنے والا تھا جو اس کے پراجیکٹ کو کسی بھی انجام تک پہنچا سکتا تھا۔ایک واشگاف حقیقت پر سائنسی مفروضوں کی بنیاد رکھی گئی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ زندگی عناصر میں ظہور ترتیب کا نام ہے۔ جسم کے تمام اعضاء اور اعضاء کے تمام خلیے ایک زنجیر کی صورت میں ایک دوسرے سے براہ راست یا بالواسطہ منسلک ہیں۔جسم کے ایک حصے کی کارگردگی دوسرے حصوں کو متاثر کرتی ہے۔زندگی ایک گونج ہے جو لامتناہی خلیوں کی بیک وقت کارکردگی کے نتیجے میں جسم کی حدود میں سنسناتی ہے۔عناصر کی ترتیب میں مہلک رخنہ اندازی کا نام موت ہے۔زنجیر کی ایک کڑی ٹوٹی اور سارا سسٹم ناکارہ ہو گیا۔خواہ یہ کڑی دل کی دھڑکن ہو یا دماغی نسوں کا نظام ترسیل۔جگر کی بیکاری ہو یا گردوں کی لاچاری،اگر زنجیر کی کڑی کھٹاک سے ٹوٹے تو انجام مرگ مفاجات ہے۔۔۔اگر کڑی لچکیلی ہو کر ڈھیلی ہو جائے اور اپنی وضع تبدیل کر کے دھیرے دھیرے شکست وریخت کی جانب بڑھے تو موت کا عمل طوالت اختیار کرتا ہے۔ *برٹل سوچ رہا تھا*

ایک خیال یہ تھا۔۔۔کہ جمے ہوئے شخص کے بارے میں یہ فرض کرلیا جائے کہ وہ بے ساختہ برفیلے طوفان کی زد میں آ گیا تھا کچھ دیر اس طرح کہ جمنے سے پہلے عناصر میں ترتیب کا عمل متاثر نہیں ہوا تھا۔زنجیر کی ساری کڑیاں سلامت تھیں۔خلیوں میں شکست وریخت نے آغاز نہیں کیا تھا۔جب خون کی نالیاں دھات کی طرح سخت ہو رہی تھیں تو خون کا نظام گردش کام کرتا تھا اور جب دھات کی نالیوں میں خون کا سنگ شجر پتھرایا تو دماغ کے خلیوں کو صدمہ نہیں پہنچا تھا۔درجۂ حرارت اچانک اتنا زیادہ گر گیا کہ موت گھبرا گئی تھی اور توڑ پھوڑ کا عمل شروع ہونے سے ذرا پہلے جسم کی برف، فضا کی یخ بستگی کا حصہ بن گئی تھی۔ دل آدھی دھڑکن میں اور دماغ آدھی غنودگی میں پتھرا گیا تھا۔جسم کے سارے خلیے برفیلی نیند میں سو گئے تھے اور جمے ہوئے خواب میں رکے ہوئے وقت کو دیکھ رہے تھے۔۔۔وقت کا جبر چونکہ حیاتیاتی سلسلے پر وار کرتا ہے چنانچہ وقت کی دست درازی اس جمے ہوئے جسم کی حدود کی خلاف ورزی نہیں کرسکتی تھی۔

ایک مفروضہ یہ تھا۔۔۔کہ اگر پگھلاؤ کا عمل مشاقی سے کیا جائے تو زندگی دوبارہ ظہور پذیر ہوسکتی ہے۔اس لیے ضروری تھا کہ جسم کے تمام خلیے، ایک ہی درجہ حرارت پر رہیں اور بیک وقت برف کی وہ چادر کھینچ لی جائے جس کے اربوں کھربوں ریشے ہر رگ و ریشے میں سرائیت کر گئے ہیں۔جس کے تمام خلیوں کا بیک وقت اس عمل سے گزرنا نہ صرف ضروری تھا بلکہ لازم تھا۔۔۔جسم کے تمام خلیوں پر بیک وقت، بیک درجہ حرارت برف شکنی کا عمل۔۔۔یہ نصب العین تھا جو قدیم برفیلے تالے کے لیے جدید وجدانی کنجی ثابت ہوسکتا تھا۔

اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے شیشے کا ایک حساس کیپسول نما چیمبر بنایا گیا تھا۔جس کے اندر نصب آلات کی مائیکروویو حرارت ایک جال کی صورت میں جسم کے اندر اور باہر برابر سرایت کرسکتی تھی۔یہ طے تھا کہ اگر جسم کی کھال پہلے پگھل جاتی تو خون کی

منجمد نالیوں کا ناکارہ پن جلد کو غذا فراہم کرنے میں ناکام رہتا اور جلد مر جاتی ۔اگر خون کی نالیوں اور ان کا سیال پہلے پگھل جاتا تو دل کی جمی ہوئی دھڑکن پگھلنے سے پہلے ہی نظام گردش قتل ہو جاتا۔اگر دل دھڑکنے سے پہلے، دماغ اپنی برفیلی غنودگی سے جاگ جاتا تو لامتناہی نسیں اتنی تعداد میں دم توڑ دیتیں۔۔۔جتنی گنتی کا تصور ناممکن ہے۔اس آشوب سے بچنے کے لیے حرارت کا جال اربوں انفرادی لہروں کی شکل میں تمام جسم پر عمل کرنے والا تھا۔

برٹل کو اپنی مجبوریوں اور محدود وسائل کا بخوبی اندازہ تھا۔اس کے آلات کے لیے ناممکن تھا کہ وہ جسم کے ہر خلیے میں اتر سکے۔کیونکہ انسانی جسم لامحدود ہے۔لامتناہی ہے۔۔۔بے حد ہے اور پھر انسانی دماغ کے خلیوں کی وسعت کا اندازہ فی الحال انسانی دماغ کے بس کی بات نہیں ہے۔

انسانی دماغ کی صرف بالائی پرت میں ایک سو بلین نسیں ہیں اور ہر نس شاخوں کے ذریعے چھ سو ساٹھ ہزار دوسری نسوں کے ساتھ منسلک ہے۔برٹل کو دماغ کی بے انت پہنائی کے سامنے اپنی کم مائیگی کا احساس تھا۔وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ انسان اپنے دماغ کو اتنا ہی سمجھتا ہے جتنا کائنات کی پہیلی کا علم اس کے محدود دائرۂ اختیار میں ہے۔

۔۔۔البتہ برٹل نے ایک اہتمام ضرور کیا تھا۔وہ یہ کہ حرارت کی لہروں کا جال دماغ کے اندر نہایت گھنا اور گنجلک بنایا گیا تھا۔دماغ چونکہ رئیس بدن ہے چنانچہ خصوصی اہتمام کا تقاضا کرتا ہے۔اسی تقاضے کو مدنظر رکھا گیا تھا یوں کہ حرارت کی لہریں منہ زور بارش کی طرح دماغ کی کھیتی کو سیراب کریں۔

یہ مائیکرو ویو کیپسول ایک کنٹرول کے ساتھ منسلک تھا جہاں جسم کے تین سو پچاس مختلف مقامات کا درجہ حرارت دیکھا جا سکتا تھا۔ان میں سے ڈیڑھ سو مقامات صرف دماغ کے تھے۔اعضائے رئیسہ کی کارکردگی جانچنے کے لیے کنٹرول سسٹم زیادہ طرف داری کا

مظاہرہ کرنے کی پوزیشن میں تھا۔سسٹم میں گنجائش رکھی گئی تھی کہ اگر جسم کے کسی مقام کا درجہ حرارت سٹینڈرڈ سے کمی یا بیشی دکھائے تو اسے فوراً راہِ راست پر لایا جاسکے۔اس بات کا خدشہ تھا کہ جسم کے مختلف حصے چونکہ ٹھوس، مائع اور گیس ہونے کی وجہ سے مختلف نقطہ پگھلاؤ رکھتے ہیں اس لیے بارہا یہ ضرورت پڑے گی کہ کنٹرول سسٹم کے ذریعے درجہ حرارت میں کمی بیشی کی جاسکے۔یوں کہ سارے جسم کا ایک سٹینڈرڈ درجہ حرارت اور نقطہ پگھلاؤ رہے۔ کنٹرول سسٹم کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ تمام اعضائے رئیسہ کا بالخصوص اور جسم کے باقی خلیوں کو بالعموم سہ جہتی عکس کے ذریعے کمپیوٹر کی سکرین پر دکھاتا تھا۔عکس کو بڑا کر کے خلیوں کی کارکردگی دیکھی جاسکتی تھی۔

ایک مفروضہ یہ تھا کہ جمے ہوئے وقت کی طاقت کو نہ آزمایا جائے کیونکہ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ایک مفروضہ یہ تھا۔۔۔کہ اگر خوش قسمتی سے پگھلا ہوا جسم زندگی سے ہمکنار رہوا تو مختلف حیاتیاتی مسائل کا شکار ہوسکتا ہے۔مثلاً فوری خوراک کی ضرورت،سال ہا سال سے رکے ہوئے خون کی لزوجت کا ردو بدل،شریانوں کے سکڑاؤ اور پھیلاؤ کے مسائل، خلیوں کی جھلیوں کے بے ربط آہنگ وغیرہ۔ایسی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ضروری ادویات،انجکشنوں اور آلات کو ابتدائی طبی امداد کے طور پر تیار رکھا گیا تھا۔

ایک مفروضہ،ایک خدشہ تھا۔۔۔۔یہ کہ مفروضے غلط ہیں۔

آخری مفروضہ ایک امید تھی۔۔۔اور وہ یہ ہے کہ مفروضے درست ہیں۔

برٹل کو بار بار یہ حقیقت ورطۂ حیرت میں ڈالتی تھی کہ جما ہوا شخص غیر معمولی طور پر زندہ سا کیوں نظر آتا تھا۔ساری سائنسی تحقیق اس منجمد جسم کے سامنے بے بس نظر آتی تھی۔ اب تک یہ بات طے تھی کہ برف زندہ جسم کے لیے دودھاری تلوار کی طرح ہے۔جب جسم جمتا ہے تو ہلاکت خیز تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور جب جسم پگھلتا ہے تو اندوہناک شکست وریخت عمل میں آتی ہے۔خلیوں کے اندر اور باہر جمی ہوئی برفیلی قلموں کی تخریب کاری سے

خلیوں کی تباہی، شریانوں کی دراڑیں، آکسیجن کی معطّلی اور کیمیاوی تبدیلیاں دو دھاری تلوار کا پہلا وار ہے۔ جب جما ہوا جسم پگھلتا ہے تو سوزش کی وجہ سے خلیوں کا پھٹنا اور کیمیاوی زخم آلودگی تلوار کی دوسری دھار کا وار ہوا کرتا ہے۔

مگر یہ بہت غیر معمولی دریافت تھی کہ اس شخص کے خلیوں کے اندر اور باہر برف کی قلمیں نہیں جمی تھیں۔ تمام جسم شفاف شیشے کی طرح جما ہوا تھا۔ سائنس کی رو سے ایسا صرف اس وقت ہوتا ہے جب جمنے سے پہلے جسم کے اندر چند خاص محلول بھرے جائیں۔ مگر یہ تو جدید تحقیق ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ شخص تمام تر سائنسی تیاری کے ساتھ منجمد ہوا تھا۔ البتہ یہ ضرور ممکن تھا کہ اس کے جسم نے دوران انجماد ایسے ہارمون تو اتر اور توازن کے سات نظام گردش میں داخل کیے کہ سارا جسم ان کی لپیٹ میں آ گیا۔ بہر حال جو کچھ بھی ہوا غیر معمولی ہوا۔

بظاہر بہت سادہ سی منطق برٹل کے لیے حوصلہ افزائی کا باعث تھی۔ اگر یہ جسم اتنی فنکاری کے ساتھ جم سکتا ہے تو اتنی ہی کاریگری کے ساتھ پگھل بھی سکتا ہے۔ بس یہی ایک آس تھی جو راہنما تھی۔ ورنہ تمام تر علم اور سائنسی آلات سے لیس ہونے کے باوجود برٹل کو اس خیال سے جھرجھری آتی تھی کہ وہ برف کے ہاتھوں سے زندگی کھینچ لے گا۔

''گڈ لک'' ایوا نے برٹل کے ہونٹوں کو چوما اور بے ساختہ وارفتگی کے ساتھ بغل گیر ہوئی۔ بہت دیر بعد جب وہ برٹل سے علیحدہ ہوئی تو تحسین نے دائیں ہتھیلی ہوا میں پھیلائی۔ اس کے اوپر برٹل نے ہاتھ رکھا جسے تحسین نے اپنے بائیں ہاتھ سے ڈھانپتے ہوئے ہمت افزا جنبش دی اور کہا:

''تم کہا کرتے ہو کہ میرے بنائے ہوئے پتھر کے مجسمے جنبش کرتے ہیں۔۔۔ چلتے ہیں۔۔۔ میں یہی بات تمہارے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔''

برٹل نے ایوا کے بے ساختہ پن اور تحسین کے امید افزا لفظوں کا جواب مسکراہٹ

سے دیا۔اس کی مسکراہٹ کے پیچھے برفیلی سنجیدگی کی سنسناہٹ تھی اور کی نظریں ایوا اور تحسین کو دیکھنے کے باوجود کہیں اور تھیں۔

برٹل اپنی لیبارٹری میں داخل ہوا تو برف کا مستطیل بلاک ایک سٹریچر پر رکھا ہوا تھا۔ یہ سٹریچر ایک شیشے کے بنے ہوئے بیضوی کیپسول نما کمرے میں تھا۔ بیضوی کیپسول کا پیندا چپٹا تھا۔انتظامات مکمل تھے۔کیپسول کے اردگرد بارہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے سامنے کمپیوٹر کی سکرین تھی۔ لیبارٹری کی چھت اور دیواریں مختلف رنگوں کے قمقموں کی جلتی بجھتی روشنیوں سے دمک رہی تھیں۔ بارہ لوگوں میں سے چھ جمے ہوئے انسان کے دماغ پر نگراں تھے۔ باقی چھ جمے ہوئے جسم پر پہرہ دے رہے تھے۔ برٹل کے پاس بظاہر کوئی کام نہیں تھا۔ وہ ایک کونے میں بیٹھ گیا جہاں نشست نسبتاً بلندی پر تھی۔ ایوا اور تحسین اس کے پہلو میں براجمان تھے۔

برٹل نے منجمد بلاک کو دیکھا جو دھندلا تھا جیسے کچی برف سے بنا ہوا۔اس نے بارہ مردوں اور عورتوں کے گروپ کو دیکھا جن کی نظریں سامنے کی سکرینوں پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ کیپسول کا اندرونی درجۂ حرارت بلند ہونے لگا۔منفی چار درجہ حرارت تک مستطیلی بلاک اگرچہ جسامت میں جوں کا توں تھا مگر اس کی شکل میں ایک بے نام سی اجنبیت آ گئی تھی جو صرف محسوس کی جاسکتی تھی۔اس کے بعد واضح تبدیلیاں نمودار ہونا شروع ہوئیں۔ برف جاگنے لگی۔ بلاک میں روپہلی لکیریں دوڑنے لگیں۔ کہیں ایک سیمابی شریان بیدار ہو کر بجلی کی طرح کوندتی مگر کند چمک دیتی اور اس کے اندر کا پارہ خون کی طرح دوڑتا۔ پھر برف کی دیواروں کا پلستر اکھڑا۔قاش قاش اور قتلہ قتلہ گرنا شروع ہوا۔ پھر دیواروں کو پسینہ آیا جو آڑی ترچھی لکیروں میں بہنے لگا۔سٹریچر کی مستعد نالیاں سیال جذب کر کے ایک جگہ پر محفوظ کرتی جارہی تھی۔ پگھلتی ہوئی مستطیل نے شکل بدلنی شروع کی تو ایک سرمئی شبیہہ کا ہیولا واضح ہونے لگا اور برف کی سیم پر سیاہی کی برتری دکھانے لگا۔

ایک شخص سٹریچر پر دراز تھا۔سراپا تناؤ اور تشنج میں تھا۔لباس کا نارنجی رنگ جو برف نے چوس لیا تھا۔ پگھلتے ہوئے سیال نے واپس لوٹا دیا۔اس عمل میں گردن اور ہتھیلیوں پر بھی نارنجی دھبے پڑ گئے۔ جب درجۂ حرارت صفر پر آیا تو جسم کا تناؤ اگرچہ جوں کا توں تھا مگر ایک بے نام سی اجنبیت تبدیلی کا پتا دیتی تھی۔اس کے بعد واضح تبدیلیاں نمودار ہونا شروع ہوئیں۔کمر کا زخم ٹوٹا اور سٹریچر کی سطح سے مس ہوا۔انگلیوں کی پوریں ہتھیلیوں سے دور ہونے لگیں گردن کی قوس ڈھیلی پڑ گئی۔ پنڈلیوں کی جمی ہوئی ضد مان کر پھیلاؤ میں آ گئی۔سارے جسم نے سٹریچر کی افقی سطح سے سمجھوتا کیا اور بڑھتے ہوئے درجہ حرارت سے رستی ہوئی ڈھیل کو خلیے خلیے میں سرایت کیا۔سٹریچر نے سپردگی کا انداز سراہا اور جسم کو خشک کرنے کا عمل جاری رکھا۔

درجۂ حرارت صفر سے مثبت ایک کی طرف گامزن تھا۔۔کوئی معجزہ رونما نہ ہو سکا تو پگھلاؤ روک دیا گیا۔ برٹل نشست سے بلند ہوا اور ایک شخص کے عقب میں جا کھڑا ہوا جو دماغ پر نگران تھا۔ایک لمحے کو اس نے کمپیوٹر کے مانیٹر میں جسم کا ہیولا دیکھا اور اس شخص سے اٹھنے کی درخواست کی۔ برٹل نشست پر بیٹھا۔اس نے جمے ہوئے شخص کے دماغ میں سفر شروع کیا۔دماغ کے عین درمیان میں پن ہل باڈی تھی۔ برٹل مسکرایا۔اسے ڈیکارٹ یاد آیا جس کے مطابق دماغ کا یہ حصہ روح کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ برٹل نے روح کی آماج گاہ دیکھی اور نشانہ لیا۔

پھر اس نے ریڑھ کی ہڈی دیکھی اور ہدف مقرر کیا۔ پھر اس نے دل کو نشان زد کیا اور آخر میں پیٹ کی نسوں کا جمگھٹا سولر پلیکسِس تلاش کیا اور شست لگائی۔ برٹل نے جسم کے ان چاروں مقامات پر سُبک برقی رو کے چار تیر چھوڑے۔ جو ایک سیکنڈ کے اندر مگر باری باری مقررہ ترتیب میں چاروں جگہوں پر لگے۔۔۔ پہلا شہابِ ثاقب تھا جو دماغ کی کائنات میں چھوٹا۔دوسرا ناوکِ نور تھا جو ریڑھ کی ہڈی کے پہلے اور دوسرے مہرے کے

درمیان سے گزرتا ہوا حرام مغز میں ترازو ہوکر پاش پاش ہوگیا۔تیسرا تیر اپنی اَنی پر شعلۂ جاں لپیٹے ہوئے دل کے رفتار ساز میں اُتر گیا اور چوتھے نے آسمانی بجلی کی طرح سولر پلیکِسس کو نشانہ کیا تو اسے ڈی۔ایچ الارنس یاد آیا جو جسم میں اُگے ہوئے اس سورج مکھی کے کھیت کو شعور کی آماج گاہ سمجھتا تھا۔

برٹل نے دیکھا۔۔۔کہ دل نے اپنی باقی آدھی دھڑکن مکمل کی۔جب دل کا آدھا ذخیرہ شریانِ کبیر میں داخل ہوا تو اس کی دیواروں پر رُکے ہوئے جیسے اس ریلے کے ساتھ ہوئے۔جیسے رکے ہوئے دریا کا پانی سیلاب کے منہ زور ریلے کی رفتار پکڑتا ہے۔ساتھ ہی پھیپھڑوں اور جسم سے آنے والی وریدوں نے اپنا سیال دل کے برتن میں انڈیلا۔

اس نے صحرا کے جسم پر گیلی ریت کے چمک دار ذرّوں کو اُگتے ہوئے دیکھا۔۔۔یہ ماتھے کا پسینہ تھا۔اس نے رونگٹوں کا جنگل لرزتے ہوئے دیکھا۔بالوں کی جڑوں سے پانی رِس رہا تھا۔۔۔یہ جسم کا پسینہ تھا۔اس نے اعضائے رئیسہ کی لرزش دیکھی۔پٹھوں کی جلد کے اوپر خون کی سرخی کو کروٹیں بدلتے ہوئے دیکھا۔اس نے رطوبتوں کی شمعیں پگھلتی ہوئی دیکھیں۔اس نے کانپتی آنکھوں کے لرزتے پپوٹے دیکھے جن کے کونوں سے بہتے ہوئے آنسو رخساروں کے لرزیدہ رونگٹوں کی نمی جذب کرتے تھے۔اس نے پلکوں کی چلمن کھلتی ہوئی دیکھی۔رنگین آنکھوں کی پتلیوں کو پھیلتے اور سکڑتے دیکھا۔اس نے ہونٹوں کو کانپ کر کھلتے دیکھا۔اس نے برفیلی نیند سے جاگتے ہوئے چہرے کے تیور دیکھے جو حیرانی کی جانب گامزن تھے۔اس نے تھرکتی حرکت کی بیساکھیوں پر چلتی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔۔۔جو ابھی کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھیں۔اس نے پوروں کی رنگینی کو افزودگی کرتے دیکھا۔اس نے ہتھیلیوں پر متحرک ریکھائیں دیکھیں جو نظام گردش کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چل رہی تھیں۔۔۔وہ جسم کے ہر خلیے کو بیک وقت نہیں دیکھ سکتا تھا مگر دیکھنا چاہتا تھا۔وہ چاہتا تھا کہ ہر خلیہ باری باری جاگے تاکہ وہ باری باری زندگی کا عمل دیکھ سکے یہ ممکن نہیں

تھا۔ اُسے اس بات کا افسوس بھی نہیں تھا کیونکہ مطمحِ نظر نظارہ کرنا نہیں تھا بلکہ اس شخص کو دوبارہ زندہ کرنا تھا جسے برف نے برفا دیا تھا۔

زمین میں دبی ہوئی صدی یا شاید ہزاروں صدیوں کو ہوا لگی۔ مگر یہ ہوا کنٹرول حالت میں تھی۔ شیشے کا کیپسول جراثیم سے پاک تھا۔ پھیپھڑے سرعت سے صاف ہوتے رہے اور پھر سینے نے باقاعدہ تنفس کا عمل شروع کیا۔ کئی سال پہلے کھینچی گئی سانس کیپسول کی ہوا میں شامل ہوئی اور نئی سانس جسم کے اندر جذب ہونا شروع ہوئی۔ آنکھوں سے آنسو مسلسل گر رہے تھے مگر پلکیں کچھ دیر پھڑ پھڑانے کے بعد ساکن ہوگئیں۔ برٹل نے اپنے کمپیوٹر میں دائیں آنکھ کا عکس واضح کیا اور اس میں روشنی کی شعائیں پھینکی۔ پتلی پہلے سکڑی پھر پھیلی۔ دماغ پر متعین عملہ نہایت مستعدی سے تفصیلات کا جائزہ لے رہا تھا۔ ایک موقع پر دماغ متوقع جسامت سے دو نینو میٹر زیادہ پھیلا تو سٹیرائیڈ کا انجکشن دینا پڑا۔ پھر جونہی دماغ اپنی نارمل جسامت پر آیا تو سٹیرائیڈ کا اثر زائل کیا گیا۔

پگھلا ہوا شخص دو دن تک اسی کیپسول میں رہا۔ ہر چھ گھنٹے بعد بارہ لوگوں کی شفٹ تبدیل ہوتی اور اتنے ہی افراد پر مشتمل عملہ کام شروع کرتا۔ خوراک انجکشن کے ذریعے اس شخص کو پہنچ رہی تھی۔ نظام انہضام آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا تھا مگر وہ شخص خالی آنکھوں سے مسلسل چھت کی طرف گھور رہا تھا۔ اس دوران دو مرتبہ جسم کا درجہ حرارت بڑھا جسے کنٹرول کیا گیا۔ سانس ہموار تھی۔ کبھی کبھی آنکھیں لرزتیں ان دو دنوں میں اس نے چند بار آنکھیں کھولیں ورنہ پلکیں باہم رہتیں اور بند آنکھوں کی تھرتھراہٹ پپوٹوں پر دستک دیتی رہتی۔ برٹل دو دن مسلسل لیبارٹری میں رہا۔ اس دوران وہ کبھی کبھی بیٹھے ہوئے اونگھ لیتا۔ ایوا اور تحسین آتے جاتے رہتے تھے۔ جسم میں قدیم خون کامیابی سے گردش کر رہا تھا۔ اس کا بلڈ گروپ اے بی پازیٹو تھا۔ مگر یہ ایک انکشاف تھا کہ اس کے خون اور رطوبتوں کا کیمیاوی تجزیہ آج کل کے انسانوں سے قدرے مختلف تھا۔ پندرہ دن کے بعد اس شخص کو کیپسول سے

نکال کر گھر میں لا کر لٹایا۔

ایوا نے ارغوانی وائن گلاس میں انڈیلی تو وہ بنفشی ہوگئی۔ بادل گھر کر آئے تھے۔ جب ایوا گلاس ہاتھ میں پکڑے ہوئے باہر برآمدے میں آئی تو موسم سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ اور وائن کا رنگ اودا۔ سرمئی بادلوں کا ایک اور ٹکڑا سورج کے سامنے آیا اور ایوا نے قرمزی رنگ کا پہلا گھونٹ بھرا اور گلاس کو پتھر کی سل پر رکھ کر سگریٹ سلگایا اور ایک لمبا کش اس راستے کی جانب دیکھتے ہوئے لیا جہاں سے برٹل نے واپس گھر آنا تھا۔ وائن کا رنگ سیاہ تھا۔ پہلے بارش دھویں کی شکل میں برس رہی تھی مگر اب تو جیسے ململ کا پورا تھان کھل کر ایوا کی آنکھوں کے آگے لہرا رہا تھا۔ برآمدے کے شیڈ سے پانی جھالر کی شکل میں گر رہا تھا۔ آج تو بارش کپڑے پہن کر برس رہی ہے، ایوا مسکرائی۔ آسمانی بجلی کی ایک تجریدی لکیر آسمان میں پھٹی۔ چمک وائن کے گلاس میں پڑی اور ایک بہت بڑا شنگرفی دھبہ ایوا کی سفید قمیص پر جگمگا کر غائب ہو گیا۔

ایک دھیمی آواز نے قدیم یونانی زبان میں سرگوشی کی۔

''پانی''

بے ساختہ گھوم کر ایوا نے پیچھے دیکھا تو چوکھٹ کے سہارے وہ دروازے میں کھڑا تھا۔ ایوا کی آنکھیں پھیل گئی۔ جواب نہ ملنے پر اس شخص نے غور سے ایوا کو دیکھا اور عربی میں کہا:

''پانی چاہیے، پیاس لگی ہے۔''

ایوا ابوالہول کی طرح پتھرا گئی۔ اس کے ہاتھ کھلے۔ وائن کا گلاس پاؤں میں گر کر ٹوٹا۔ سگریٹ کچھ دیر بڑی انگلی کی پور سے چپکا رہا، پھر گرا اور وائن میں بجھ گیا پہلے فارسی اور پھر سنسکرت میں آواز آئی۔

''پانی۔۔۔''

باب پنجم

زیتون کے درخت کے پاس آ کر زینو رکا۔ ایک چھوٹا تیر ترکش سے نکالا اور کمان میں بھرا۔ زیتون کے درخت میں ریشمی سرسراہٹ ہوئی۔ سورج موسم بہار کی سہ پہر میں تھا اور اس کے پیلے تھال کو بادل کے مہین پارچے نے نقرئی کر دیا تھا۔ تیر کا سرا سونے کا تھا اور دم کے گرد سونے کا پترا لپٹا ہوا تھا۔ زینو نے تیر کو ڈورے پر کستے ہوئے زیتون کی سرسراہٹ کو دوبارہ سنا۔۔۔ درخت تیار تھا۔ زینو نے اپنا بایاں قدم آگے اور دایاں ذرا پیچھے زمین پر جمایا اور سورج کے نقرئی تھال کا نشانہ لیا۔ کمان لچک کے آخری حد تک پہنچی اور زینو کی داہنی مٹھی لچکیلی اور نرم حرکت کرتی ہوئی دائیں کان کی لو کے پیچھے جا رُکی۔ زینو نے کھلی ہوئی دائیں آنکھ سے دیکھا کہ تیر کی نوک سورج کے مرکز میں ہے۔ اس نے سانس چھاتی میں جامد کیا اور داہنی مٹھی کو کھولا۔ کمان کی تشنج بھری انگڑائی پوری توانائی کے ساتھ چھک کی آواز دیتی ہوئی تیر کے ساتھ لپٹ کر اڑی۔ چھک کی آواز آتے ہی سررررر۔۔۔ کی سنسناہٹ کے ساتھ درخت نے اپنی کمان سے کوہی ابابیل کا تیر چھوڑا۔ تیر اور کوہی

ابابیل فوراً نظروں سے اوجھل ہوگئے۔اب ابابیل تیر کے بائیں طرف برابر رفتار سے اڑ رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے اعتبار سے ہوا میں ساکن تھے۔ابابیل نے دیکھا کہ تیر کی سانس اکھڑ رہی ہے۔اس کا تناؤ ٹوٹ رہا ہے اور وہ دھیرے دھیرے نیچے گرنا شروع ہوا ہے۔کو ہی ابابیل نے اپنے پنجے تیر میں گاڑے۔اپنی رفتار کی رو میں وہ اور آگے نکل گئی اور پھر ایک چکر کاٹتی ہوئی واپس اسی رستے پر آئی جس پر وہ پہلے اڑی تھی۔ابابیل نے ہوا کے صحرا میں پرواز کی لکیر کو پہچانا اور واپس اسی رستے کا سفر کیا۔زینو نے دیکھا کہ سورج کے تھال میں ایک سوراخ ہے جو بڑھتا چلا جا رہا ہے۔پھر یہ سوارخ بے ترتیب ہوگیا اور پھر پھڑ پھڑانے لگا۔ابابیل کو زینو نے دونوں ہاتھوں میں پکڑا۔اس کے پنجے تیر میں پیوست تھے جو زینو نے آزاد کیے۔ابابیل دوبارہ درخت پر جا بیٹھی۔زینو نے تیر کو دیکھا جس پر جا بجا چھوٹے چھوٹے سوراخ بن گئے تھے۔ یہ تیر پرانا ہوگیا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے پرانا تیر زمین پر پھینک دیا۔

اس نے سوچا واپس مڑا اور گرایا ہوا تیر اٹھا کر ترکش میں رکھ لیا۔ گھنے جنگل میں چلتے ہوئے ایک درخت پر زینو نے رنگین طوطوں کا غول دیکھا۔اگرچہ ان طوطوں کے پروں میں قوس قزح کے سبھی رنگ تھے مگر سرخ اور نیلا رنگ نمایاں تھا۔وہ بے ساختہ چہچہا رہے تھے۔ زینو نے انکی طرف نظریں اٹھائیں وہ یک دم خاموش ہوگئے۔ایک سرخ اور سفید طوطے نے اپنا جسم جھٹک کر پروں میں ہوا بھری تو وہ پھول گیا اور اس کا رنگ خاکستری ہوگیا۔زینو نے اپنا دایاں بازو پھیلایا۔خاکستری رنگ کا طوطا درخت سے اڑا اور زینو کے ہاتھ پر آ بیٹھا۔اس کا رنگ دوبارہ سرخ اور سفید ہوگیا۔زینو نے اپنا ہاتھ تھرتھرایا۔طوطے نے پھر پروں میں ہوا بھری اور خاکستری ہوگیا۔زینو طوطے کے ساتھ رنگوں کا کھیل کھیلتے ہوئے چلتا رہا۔جنگل جھیل کے کنارے ختم ہوگیا۔جھیل کے کنارے پر جونہی طوطے نے ایوا کو دیکھا تو ارغوانی رنگ کی اڑان بھری اور جنگل میں غائب ہوگیا۔

زینو کی طرف ایوا کی پشت تھی۔ وہ گلابی رنگ کا ڈھلا لباس پہنے ہوئے تھی جو اس کے جسم کی رنگت کے ساتھ میل کر کھا کر اس کے سراپے کی اضافت محسوس ہوتا تھا۔ ایوا نے گلابی مٹھی کھولی۔ تیر نکلا اور کچھ فاصلے پر کھڑے سٹینڈ پر ایستادہ بورڈ کے بیرونی ہرے دائرے میں پیوست ہو گیا۔ زینو اسے تیر اندازی کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ تیر ہرے نیلے اور سرخ دائروں میں لگتے رہے۔ جب ایک تیر مرکزی پیلے دائرے میں پیوست ہوا تو ایوا نے خوشی سے چیخ لگائی اور وارفتگی میں اپنے بائیں پاؤں کی ایڑی پر گھومی۔ زینو اس کی نظروں میں گھوما۔ وہ مڑی اور زینو کی طرف چلنے لگی۔ جب وہ سورج اور زینو کے درمیان سے گزری تو زینو نے دیکھا کہ ایوا کے اردگرد کی دھوپ گلابی ہو گئی ہے۔ زینو نے اپنی آنکھوں کو ملا:

''مجھے تیر اندازی پسند ہے۔ میں بچپن سے یہ کھیل کھیلتی آئی ہوں۔'' زینو اور ایوا چلتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے جہاں ایوا کا ترکش پڑا تھا۔ شفق بنتے ہوئے سورج کی چمک ایوا کی کمان کے ایلومینیم پر پڑی تو زینو کو چمک کے گرد قوس قزح کا دائرہ نظر آیا۔ زینو نے اپنی آنکھوں کو ملا ''جب تم سورج کے سامنے چلتی ہو تو تمہارے اردگرد کی دھوپ گلابی ہو جاتی ہے اور جب سورج کی شعاعیں تمہاری کمان کی دھات پر گرتی ہیں تو ٹوٹ کر قوسِ قزح میں بدل جاتی ہیں۔''

زینو نے کہا تو ایوا بے ساختہ مسکرائی اور ڈوبتے ہوئے سورج کی شفق اس کے رخساروں پر جم گئی۔

''کیا وقت ہوا ہے؟'' ایوا نے پوچھا۔ زینو نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھے بغیر بتایا۔ ''ساڑھے پانچ۔'' ایوا نے کچھ دن پہلے زینو کی کلائی پر گھڑی باندھی تھی۔ گھڑی اس کی کلائی پر باندھتے ہی رک جاتی تھی۔ ایوا نے زینو کا بایاں ہاتھ اٹھا کر گھڑی دیکھی۔۔۔ وہ رُکی ہوئی تھی۔

موسم بہار میں پورن ماشی کی رات تھی۔ گھر کے باہر الاؤ کا اہتمام تھا۔ توت اور دھریک کی لکڑیاں شعلے اڑا رہی تھیں۔ جب تحسین الاؤ میں دیار کے درخت کی کونیں ڈالتا تو آگ اور زیادہ بھڑک اٹھتی۔ کھانے سے پہلے سرخ وائن کا دور چل رہا تھا۔ گلاسوں کے اندر ٹھہری ہوئی وائن کو شعلوں کا عکس ہلانے کی کوشش کرتا تھا۔

زینو کے لیے شراب راولپنڈی سے تیار ہو کر آتی تھی۔ تحسین کا ایک دوست مری بروری کا ریٹائرڈ ملازم تھا۔ وہ انگوروں کی وائن بنانے کا ماہر تھا۔ انگوروں کی بیلیں مانسہرہ کے قریب زمین میں اگتی تھیں جو کھاد سے پاک تھی۔

''زینو! شراب کیسی ہے؟'' برٹل نے پوچھا۔

''خوش ذائقہ ہے۔ نرم نشہ کرتی ہے۔ ہم یونان میں ایسی شراب سرخ انگور سے بناتے تھے۔''

برٹل نے پورے چاند کو دیکھا جو جزیرے کی صاف اور شفاف آب و ہوا میں نہایت اجلا اور بڑا نظر آتا تھا۔ اندھیری راتوں میں ستارے اتنے زیادہ اور روشن ہوتے کہ خوش کن وحشت ہوتی تھی۔ دن میں آسمان کا نیل اس قدر دھلا ہوتا کہ سبز درختوں کے پیچھے آسمان کی نیلاہٹ آنکھوں کو حیران کرتی۔ سمندر آسمان سے کچھ سوا نیلا نظر آتا۔

''کیا آپ لوگوں کو اس جزیرے پر وحشت نہیں ہوتی؟'' اچانک زینو بولا۔

''کیا تمہیں ہوتی ہے؟'' تحسین نے پوچھا۔

''ہاں''

''واقعی۔۔۔ کیوں؟'' ایوا نے پوچھا۔

''یہ جزیرہ دھندلا دھندلا ہے۔ جیسے ہر طرف غبار پھیلا ہو۔ جیسے کسی نے دھویں اور گرد کی باریک چادر تان دی ہو۔ سمندر میلا ہے۔ اس کے پانی میں بو ہے جیسے کسی نے بہت زیادہ مقدار میں کاڑھا ہوا تیل سمندر میں انڈیل دیا ہو۔ اس لیے سمندر کے پانی میں

رنگوں کی باریک تہیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔سمندر کے اندر مچھلیاں بہت کم مسکراتی ہیں۔بس تیرتی رہتی ہیں۔درخت مرجھائے مرجھائے سے ہیں۔ان کے پتوں پر راکھ کی باریک تہہ پڑی رہتی ہے جو بارش سے دھلتی ہے مگر پھر بن جاتی ہے۔درختوں میں لچک کم ہے جیسے انھیں کسی نے جکڑ رکھا ہو۔کم ہوا سے ان کے پتے نہیں ہلتے۔''

زینو نے وائن کا ایک گھونٹ بھرا۔برٹل اسے غور سے دیکھ رہا تھا جبکہ ایوا اور تحسین حیرت سے۔

''کم ہوا سے یہاں کے درختوں کے پتے نہیں ہلتے۔۔۔ورنہ ہوا تو ہر وقت چلتی چلتی رہتی ہے کیونکہ درخت ہر وقت ہلتے رہتے ہیں۔درخت پیہم حرکت میں رہتے ہیں جبکہ یہاں کے درخت تو جانوروں کی طرح کبھی سو جاتے ہیں کبھی جاگ جاتے ہیں۔یہاں کونپلیں دو دن میں میلی ہو جاتی ہیں حالانکہ کونپل بہت دیر تک تازہ رہتی ہے۔یہاں کے تنے کی چھال بہت موٹی ہے، یوں لگتا ہے جیسے درخت لحاف اوڑھے ہوئے ہوں۔زمین میں اکثر درختوں کی جڑیں بیمار ہیں۔۔۔سوزش میں ہیں کیونکہ زیر زمین کھارے پانی نے جڑوں کی جلد اکھاڑ دی ہے یا چھلنی کر دی ہے۔۔۔کل میں ایک توت کے درخت کے پاس سے گزرا تو اس نے کہا مجھے کاٹو۔۔۔میں نے زمین پر کان رکھ کر سنا تو اس کی جڑیں رو رہی تھیں کیونکہ ان کی ساری جلد چھل گئی تھی۔میں پرسوں سارا دن اسے کاٹتا رہا۔درخت کے کٹنے پر لکڑی کو اتنا سکون ملا کہ وہ دو دن میں خشک ہو گئی۔'' زینو نے توت کی لکڑی کے دو ٹکڑے الاؤ میں ڈالے تو وہ بے اختیار بھڑکنے لگے۔

''جب ایسے درخت کٹ جاتے ہیں تو جڑیں سو جاتی ہیں۔ان کی سوزش علاج پاتی ہے۔۔۔ان کی جلد پرورش کرتی ہے۔''

برٹل زینو کو تسلسل سے دیکھ رہا تھا جو کہہ رہا تھا۔

''اس جزیرے کے پرندوں کے گلے بیٹھے ہوئے ہیں۔یوں لگتا ہے جیسے ہر

پرندے کے حلق میں دھواں جم گیا ہو۔ یہاں کوئل کی آواز پہاڑیوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے حالانکہ اس آواز کی بازگشت کم از کم تین بار سنائی دیتی ہے۔ یہاں کونجیں اپنی سرخ آنکھوں کو زیادہ جھپکتی ہیں اور شیر اپنی پیلی آنکھیں زیادہ سیکڑتے ہیں کیونکہ ان کی آنکھوں میں گرد اور دھواں چبھتا ہے۔''

''کیا یہاں شیر بھی ہے؟'' ایوا نے پوچھا۔

''یہاں رات کو دور کے ستارے کم نظر آتے ہیں۔ قریبی ستاروں کی چمک بھی کم ہے۔ غبار کی وجہ سے آنکھوں پر دباؤ پڑتا ہے۔ آج میں نے ایوا کو سورج کے سامنے چلتے ہوئے دیکھا تو اس کے اردگرد کی دھوپ گلابی ہوگئی اور روشنی اس کی کمان پر ٹوٹ کر قوسِ قزح بن گئی۔''

زینو کی اس بات سے ایوا کو مایوسی ہوئی۔ سہ پہر کو اس یہی بات ایوا کو نہایت خوش کن محسوس ہوئی تھی۔

''میں گزشتہ تین ماہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ یہاں کا ماحول گرد آلودہ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی اردگرد کے جزیروں کو اٹھا اٹھا کر زور سے جھٹک رہا ہے اور وہاں کا غبار اڑ کر ہمارے جزیرے میں آ رہا ہے۔۔۔ یہاں سے کہیں اور چلنا چاہیے۔''

نہیں یہ بات نہیں۔ زینو کی نظر بالکل ٹھیک ہے بلکہ ضرورت سے کچھ زیادہ ٹھیک ہے۔ میں ہر وقت اس کا طبی معائنہ کرتا رہتا ہوں۔ خواہ وہ بیٹھا ہو یا چل رہا ہو۔ سویا ہو یا جاگ رہا ہو۔ ایک آلہ مسلسل اس کے تعاقب میں رہتا ہے جو روزانہ کی رپورٹ مجھے شام کو دیتا ہے۔ زینو کی آنکھ کا عدسہ نہایت شفاف ہے۔ اتنا شفاف کہ اس کے نہ ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ قرنیۂ چشم سے لے کر پردۂ بصارت تک اس کی آنکھوں کی ساخت اتنی قابلِ رشک ہے کہ یقین نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے جیسے روشنی بغیر کسی واسطے کے سیدھی آنکھ کی پچھلی دیوار پر

عکس بناتی ہے۔ دماغ میں اس کا مرکزِ بصارت بھی بالکل نارمل ہے۔''

''تو اسے دھندلا اس لیے نظر آتا ہے کیونکہ دھندلاہٹ موجود ہے۔ غبار پھیلا ہوا ہے۔ زینو کی آنکھیں، شفاف ترین ہیں۔ اگر یہ آنکھیں کہتی ہیں کہ غبار ہے تو واقعی غبار ہے۔ یہ حقیقت ہمیں ماننا ہوگی۔''

برٹل نے پورے وثوق سے کہا تو ایوا بولی۔

''تو غبار ہمیں کیوں نظر نہیں آتا۔ کیا تمھیں نظر آتا ہے؟''

''نہیں آتا۔ مگر غبار ہے کیونکہ زینو کہتا ہے۔''

ایوا کو جزیرے کا یہ علاقہ بہت پسند تھا۔ وہ سیر کرتے کرتے اکثر یہاں آیا کرتی تھی۔ یہ بحر ہند کا ساحل تھا۔ جس کی سلیٹی رنگ کی ریت جھرجھری لیتی اور پاؤں گدگداتی تھی۔ اس ریت پر پاؤں کا پورا نشان بنتا پہلے خشک اور پھر تر ہو جاتا۔ یہ علاقہ دو پہاڑیوں کے درمیان ایک درّے کی شکل میں تھا۔ درّہ ایک طرف جزیرے میں تو دوسری طرف سمندر میں کھلتا تھا۔ اگر سمندر کی طرف رخ کریں تو بائیں جانب کی بلند و بالا پہاڑی کا بیشتر حصہ سمندر میں ڈوبا نظر آتا۔ اس پہاڑی کے اوپر ایک چٹان تھی جو پہاڑی کی چوٹی سے سمندر کے اوپر معلق تھی۔

ایوا نے دوربین لگا کر سمندر کو دیکھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ گہرا نیلا اور شفاف جو دور آسمان کے مقابلتاً ہلکے نیلے رنگ میں جا ملتا تھا۔ دوربین کے منظر نے بائیں جانب کے پہاڑی ساحل کو چھوا اور پھر منظر پہاڑی چڑھنے لگا۔ معلق چٹان پر زینو کھڑا تھا۔ اس کے سنہرے ہلکے گھنگھریالے بال لہرا رہے تھے۔ وہ بے لباس تھا اور مجسمے کی طرح ساکت و جامد۔ ایوا کا جسم لرزا اور سانس تیز ہو گیا۔ بے ساختہ دوربین اس کے ہاتھوں سے چھوٹی اور گردن میں پڑے سٹریپ کے سہارے سینے پر لٹک گئی۔ اب اسے تقریباً پانچ سو فٹ بلند چٹان پر ایک تنکا نظر آ رہا تھا۔ متجسس ہاتھوں نے دوبارہ دوربین کو آنکھوں پر

جمایا۔ ایوا نے زینو کا سراپا غور سے دیکھا۔ سر سے ٹخنوں تک متناسب خال و خد کا شاہکار۔

سنہری دھوپ میں نہایا ہوا سنہرا بدن، زینو کا دائیں جانب کا آدھا بدن سارا نظر آ رہا تھا۔ دوربین نے منظر کو مزید قریب کیا۔ زینو کے دائیں پہلو پر زخم کے سارے نشان مندمل ہو چکے تھے۔ برف نے پسلیوں سے نیچے ران تک دائیں جانب کی جلد بیکار کر دی تھی، جسے پلاسٹک سرجری کے ذریعے ٹھیک کیا گیا تھا۔ پلاسٹک سرجری میں ایوا نے برٹل کی مدد کی تھی۔ اس وقت زینو ایک مریض کی حیثیت رکھتا تھا مگر اس وقت چٹان پر کھڑا یہ زینو بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔۔۔

ایوا اس کو پاؤں تک دیکھنا چاہتی تھی مگر اس کے پاؤں چھپے ہوئے تھے کیونکہ ایوا کی جانب معلق چٹان زاویہ کھا کر ذرا بلند ہو گئی تھی۔ زینو اب چٹان کے کنارے پر تھا۔ اس نے ہاتھ بلند کر کے جست بھری۔ چھلانگ میں ہلکا خم آتا گیا اور پھر زینو سر کے بل سمندر میں اترا اور غائب ہو گیا۔ ایوا دوربین لگائے اسے پانی میں ڈھونڈتی رہی مگر کوئی سراغ نہ ملا۔ خدشات ایوا کے دل میں جنم لینے لگے۔ بالآخر وہ ساحل کی ریت پر بیٹھ گئی۔ اچانک دائیں جانب سے زینو اس کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ وہ بے اختیار اس کی طرف دوڑی۔ زینو ساحل کی ریت پر کھڑا تھا۔ فرغل اس کے ٹخنوں تک تھا۔ اس کے پاؤں ساحل کی ریت میں دھنسے ہوئے تھے، جن کے برابر ایوا کا کچھ دیر پرانا نقش پا تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔

''وہ چوٹی دیکھتی ہو تم۔ وہاں سے آ رہے ہیں ہم۔''

زینو نے اس معلق چٹان کی طرف اشارہ کیا جہاں سے اس نے چھلانگ لگائی تھی۔ اس بات پر ایوا مسکرائی۔

''اس جزیرے کی مچھلیاں بہت کم مسکراتی ہیں۔ بس تیرتی رہتی ہیں یہاں سے کہیں اور چلنا چاہیے اور وہاں جا کر دیکھنا چاہیے کہ یہ جزیرہ اتنا دھندلا اور میلا کیوں ہے۔''

زینو نے جب یہ کہا تو ایوا نے زینو کی آنکھوں کو غور سے دیکھا۔۔۔ ایوا کی نظروں

کو ٹھوکر لگی۔ اس کا چہرہ کپکپایا تو کانوں میں لٹکے ہوئے بندے ہلے۔ زینو نے بندوں کو چھوا اور کہا:

''یہ بندے اگرچہ خالص سونے کے نہیں مگر بہت خوب تراشے ہوئے ہیں۔'' ایوا کے کانوں کی لوؤں کو زینو کی پوروں نے چھوا تو ایوا نے لمس کو بہت مختلف اور دیرپا محسوس کیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے زینو کی پوروں کا کچھ حصہ کانوں کی لوؤں سے چپکا رہ گیا ہے۔ اس نے بے ساختہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔۔۔ وہ واپس گھر کی طرف آ رہے تھے۔ ایوا سوچ رہی تھی کہ زینو میں ایک خاص بات تھی جو اسے دوسروں سے مختلف کرتی ہے۔ یہ خاص بات شاید دیکھی نہیں جا سکتی البتہ محسوس کی جا سکتی تھی۔ زینو کی چال ڈھال متوازن تھی مگر دوسروں سے مختلف نظر آتی۔ اس کے سر کے ہلکے گھنگریالے بال بھی منفرد تھے۔ وہ ہوا میں عجیب طرح سے ہلتے تھے۔ زینو آنکھوں کو کم جھپکتا تھا۔ جھپکتے ہوئے پپوٹوں کی حرکت باقی لوگوں سے ذرا آہستہ لگتی جیسے کوئی قدرے سلوموشن میں آنکھیں جھپک رہا ہو۔ بولتے وقت اس کے ہونٹوں کی لرزش مختلف محسوس ہوتی۔ یہاں تک کہ ساری حرکات و سکنات زینو کو باقی لوگوں سے علیحدہ کرتی تھیں۔۔۔ زینو نے نیم کے درخت کی طرف اشارہ کر کے کہا:

''یہ درخت اگرچہ ہرا ہے، مگر بیمار ہے۔ کہتا ہے مجھے کاٹو۔ یہاں اس طرح کے بہت سے درخت ہیں۔ میں کس کس کو کاٹوں۔ یہ جزیرہ بہت اداس ہے، بہت ویران، دھواں دار اور گرد آلود ہے۔''

ایوا کو وہ دن یاد آیا جب پہلی بار دن کی روشنی میں اس نے اس جزیرے کو دیکھا۔ تو اسے ایک خواب جیسی کیفیت لگی۔ جزیرہ اتنا روشن، سرسبز اور شاداب تھا کہ اسے جنتِ ارضی کہا جا سکتا تھا۔ نیلا کچ آسمان، صاف ہوا، شفاف پانی، چہکتے پرندے مہکتے پھولدار پودے۔ رنگین مچھلیاں، قالین کی طرح بچھا ہوا سبزہ جس پر صبح اوس یوں چمکتی جیسے

کسی نے شیشہ ہتھیلی پر مل کر سبزے میں جھاڑ دیا ہو۔۔'' اورزینوا سے دھواں دار، گردآلود اور دھندلا بتاتا ہے۔اس کی بینائی بھی ٹھیک ہے بلکہ ضرورت سے زیادہ ٹھیک ہے تو کیا ہماری بینائی خراب ہے؟''

''ہماری بینائی بھی درست ہے اور زینو کی بھی۔'' برٹل نے جواب دیا۔ ایوا، برٹل اور تحسین گھر کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔سہ پہر کا عمل تھا۔ برٹل نے بات جاری رکھی۔

''دو ہزار سال پہلے کی دنیا آج کی دنیا سے یقیناً بہت زیادہ صاف ہوگی بلکہ ڈیڑھ سو سال پہلے کی دنیا بھی آج کی دنیا سے بہت زیادہ صاف ہوگی۔زینو جب برف اوڑھ کر سویا تھا تو دنیا کی آب و ہوا آئینے کی طرح شفاف تھی۔وہ دو ہزار سال سے بھی زیادہ سویا رہا۔ جب اس نے آنکھ کھولی تو وہ اس جزیرے پر تھا جو ہمارے خیال میں دنیا کا صاف ترین جزیرہ ہے۔جو ہمارے تئیں آلائشوں سے پاک ہے۔ ہماری بصارت دنیا کے گنجان آباد شہریوں کو بھی صاف بتاتی ہے کیونکہ ہمارا بصری نظام دھندلی فضا کو صاف سمجھنے کا عادی ہے۔مگر زینو کی بصارت کو یہ عادت نہیں۔ جب وہ سویا تو فضا آئینے کی طرح تھی جب وہ بیدار ہوا تو آئینہ دھندلا چکا تھا۔ دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک فضا کا یہ آئینہ وقت کے ہاتھوں میں رہا۔اوّل اوّل تو معمولی گردوغبار اڑا۔ راکھ اڑی، دھواں پھیلا،مگر گزشتہ ایک صدی سے اس گردوغبار اور دھویں کی شدت میں اچانک بے حد اضافہ ہوا اور پھر تو یہ گردوغبار طوفان کی شکل اختیار کر گیا۔۔۔زینو کا آئینہ دھندلا گیا کیونکہ اس نے صاف آئینہ دیکھا تھا۔ ہمارا آئینہ صاف رہا کیونکہ ہم دھندلے آئینے میں پیدا ہوئے اور اسے صاف سمجھتے رہے۔۔۔قصور نہ ہماری بصارت کا ہے اور نہ ہی زینو کی بصارت کا۔قصور پہلی نظر کا ہے۔''

''قصور پہلی نظر کا ہے، جو تمہارے چہرے پر پڑی تو کسی اور لڑکی کو دیکھنے کی

خواہش دم توڑ گئی۔'' برٹل نے ایوا کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے بات کو موڑ دیا۔ ایوا مسکرائی تو اس کے رخساروں میں ایک ایک ڈمپل ابھرا۔ ہر ڈمپل کسی مٹی کے سمندر میں ابھرنے والے گرداب کی طرح تھا۔ برٹل کی آنکھوں میں مسکراہٹ چمکتی رہی جو عینک کے شیشوں سے چھن کر ایوا کی آنکھوں میں اترتی رہی۔ برٹل نے ایک گہرا سانس بھرا تو اس کی آنکھیں پھر سے سنجیدہ ہو گئیں۔

''دو باتیں ہیں۔'' برٹل نے کہا۔

''ایک تو یہ کہ دنیا میلی ہے۔ ساری کی ساری دنیا۔ جو اجلی نظر آتی ہے وہ میلی ہے اور جو میلی نظر آتی ہے وہ بے حد میلی ہے۔ دوسری بات ایک مسئلہ ہے۔ وہ یہ کہ دنیا کی شفاف ترین جگہ میں زینو کو گھبراہٹ ہوتی ہے۔ کیا اسے گنجان آباد علاقون میں لے جانا مناسب رہے گا؟ اب اس کا جسم کافی حد تک صحت مند ہے۔ میرے اندازے میں وہ اٹھانوے فیصد تک فٹ ہے۔ ممکن ہے کہ چند دنوں میں وہ سو فی فٹ ہو جائے کیونکہ چند ایک جسمانی مسائل ہیں جن کا میں مسلسل علاج کر رہا ہوں اور زینو اس سے بے خبر ہے۔۔۔ کیا اسے گنجان آباد علاقوں میں لے جانا مناسب رہے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے مزید دنیا دِکھانے کے شوق میں ہمیں مزید شرمندگی اٹھانا پڑے۔'' برٹل نے بات جاری رکھی۔

''اور رہی یہ بات کہ زینو باقی لوگوں سے علیحدہ کیوں نظر آتا ہے تو۔ وہ تو یوں نظر آئے گا۔ اگر ہم سو سال پہلے کی کیمرہ فوٹو یا فلم دیکھیں تو کیا ہمیں گزشتہ لوگ ذرا مختلف نظر نہیں آتے؟ ان کی نشست و برخاست، ان کے چہرے کے تیور، ان کے دیکھنے کا انداز، ان کی آنکھوں کا تحیر۔ ان کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکان کا خم، گردن پر چہرے کا زاویہ، سر کے بالوں کے پیچ و خم، پیشانی پر اجنبی انداز میں پھیلے ہوئے بل اور سلوٹیں۔۔۔ اور لباس تو خیر مختلف ہوتا ہی ہے۔ وہ الگ بات کہ ان تصویروں اور فلموں کے جانور اور پرندے ہمیں اس طرح نظر آتے ہیں جیسے وہ آج موجود ہیں اور اگر فلموں کے جانور اور پرندے ہمیں اسی

طرح نظر آتے ہیں جیسے وہ آج موجود ہیں اگر سو سال پہلے کے لوگ اتنے مختلف ہو سکتے ہیں تو ہزاروں سال پہلے کا یہ شخص یقیناً مختلف ہونا چاہیے۔ وہ تو اس کا کرم ہے کہ حیرت ناک حد تک مختلف نظر نہیں آتا بلکہ اگر غور نہ کیا جائے تو کوئی خاص مختلف نظر نہیں آتا۔''

برٹل کی یہ بات سن کر تحسین کو قیام پاکستان کی وہ بلیک اینڈ وائٹ فلم یاد آئی جس میں قائداعظم محمد علی جناح جلسوں سے خطاب کرتے تھے۔ لوگوں کے لباس تو خیر مختلف تھے ہی ان کے چہرے بھی کچھ کچھ مختلف تھے۔ ان کی حرکات وسکنات، آنکھوں کی جھپک، جھپک کی رفتار، تاثرات، اشارے کنائے، چلنے کا انداز، بات کرتے وقت ہاتھوں کی حرکت، حرکت کرتے ہوئے ہاتھوں میں انگلیوں کے فاصلے، کلائی کا خم، ابروؤں کا چلن، نعرے لگاتے ہوئے لوگوں کے تیور، ان کے بازوؤں کی اٹھان، چلنے کی رفتار، ایک دوسرے کو دیکھنے کا طور، جھنڈے تھامنے کا طریقہ، جھنڈوں کو دیکھنے والی نظر، گاندھی جی کی چال ڈھال، ان کے پیروکاروں کا جوش وخروش ظاہر کرنے کا رنگ۔۔۔ تحسین کو یہ پرانے رنگ ڈھنگ یاد آئے۔

اسے ہٹلر کی فلم یاد آئی جس میں ہٹلر آج کے لوگوں سے مختلف نظر آتا ہے۔ اگر اُس کی مخصوص مختصر مونچھیں ذرا بڑی ہوتیں اور کارل مارکس کی داڑھی کچھ تراشیدہ ہوتی تو بھی تراش خراش انھیں ذرا سا مختلف نظر آنے سے نہ روک سکتی۔ اسے گریز اناٹمی کی کتاب یاد آئی جس میں ہنری گرے ایک تصویر میں ہم جماعت ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ہے۔ ہر ہم جماعت کے چہرے کا تاثر منفرد ہے اور آج کے دور سے ذرا سا مختلف۔ اپنے خاندان کے بزرگوں کی پرانی تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے ابھرنے اور ڈوبنے لگیں۔ آج کے لوگوں کی طرح ان کے چہرے تھے مگر تاثرات ذرا مختلف تھے۔

''اگر وقت کے اسی تناسب سے دو ہزار سال پہلے کے لوگوں کو پرکھا جائے تو تاثرات کا تفاوت حیرت ناک ہوسکتا ہے۔ اسی تناسب سے زینو تو ہرگز قدیم نہیں لگتا، بس

ذرا سا مختلف محسوس ہوتا ہے۔ دو تین نسلیں پہلے کا انسان لگتا ہے۔'' تحسین نے سوچا۔

برٹل بستر پر نیم دراز تھا۔ اس کی گردن گول تکیے پر تھی۔ عینک کے گول شیشوں سے اس کی نظریں چھن کر ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب کی سطروں پر تیر رہی تھیں۔ ایوا اس کے دائیں پہلو سے چمٹ کر سوئی ہوئی تھی یوں کہ اس کا دایاں بازو ایوا کے نیچے دبا ہوا تھا۔ برٹل کو کتاب کا ورق پلٹنے میں کافی تگ و دو کرنا پڑتی۔ وہ پہلے کتاب کو اپنے پیٹ پر رکھتا۔ اس کا ورق بائیں ہاتھ سے پلٹتا پھر کتاب کو اسی ہاتھ سے اٹھا کر آنکھوں کے سامنے رکھتا۔ وہ انسانی کلوننگ کے بارے میں پڑھ رہا تھا۔ اس نے بے اختیار کہا۔ ''کلوننگ اتنی مشکل نہیں جتنا اسے اس حالت میں پڑھنا مشکل ہے۔'' اس کے پہلو میں تھرتھراہٹ ہوئی تو اس نے دیکھا کہ ایوا اس کے اس جملے پر بے اختیار ہنس رہی ہے۔

''جاگ رہی ہو؟۔۔۔ میں سمجھا سو رہی تھی!''

''تمہاری اس بات کی بے کسی نے جگا دیا ورنہ میں سو رہی تھی۔''

یہ کہہ کر ایوا نے نیم خوابیدہ آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی نظر روشن دان کے کنارے پر پڑی۔ جہاں سے ایک تنکا آہستہ آہستہ نیچے گرنے لگا۔ کچھ دیر بعد تنکے کے خال و خد نکل آئے اور وہ انسان کا روپ دھار گیا۔ اس نے ہوا میں قلابازی لگائی اور پاؤں کے بل اتنی آہستگی سے فرش پر اترا کہ تلووں نے آواز تک نہ دی۔ زینو لباس کے بغیر فرش پر کھڑا تھا۔ برٹل کے بالکل قریب۔ زینو نے برٹل کے نیم دراز جسم کے اوپر سے اپنا بایاں بازو پھیلایا۔ کلائی گھما کر ہتھیلی ایوا کی طرف بڑھائی اور اسے دیکھتے ہوئے بولا:

''باہر پورا چاند ہے اور آدھی رات۔۔۔ آؤ۔''

ایوا نے بے اختیار اپنا دایاں ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دیا تو زینو نے اسے برٹل کے اوپر سے بغیر کسی کوشش کے اپنی طرف کھینچ لیا گویا ایوا کوئی جسم نہ ہو۔۔۔ ہوا ہو۔ ایوا کی سفید رنگ کی مہین شب خوابی، جس کا کچھ حصہ برٹل کے پہلو کے نیچے دبا ہوا تھا۔ بستر پر پڑی

رہ گئی۔ ایوا نے بے ساختہ برٹل کو پلٹ کر دیکھا مگر وہ نہایت انہماک سے کتاب پڑھ رہا تھا جو اس کے بائیں ہاتھ میں تھی۔ اپنے دائیں ہاتھ سے وہ ایوا کی شب خوابی کو گھما گھما کر تہہ کر رہا تھا گویا شب خوابی نہ ہوئی چائے کا کپ ہوا یا جلتا ہوا سگریٹ جسے لوگ مطالعہ کرتے ہوئے نیم خیالی میں پیتے ہیں۔ برٹل کی یہ لاتعلقی ایوا کے لیے عجیب تھی گویا زینو کا آنا اور ایوا کا جانا اس کے لیے بالکل بے معنی اور غیر ضروری تھا۔

''باہر پورا چاند ہے اور آدھی رات۔۔۔آؤ۔''

باہر پورا چاند تھا اور آدھی رات۔ آسمان نہایت شفاف تھا اس لیے چاند بڑا نظر آتا تھا۔ درختوں کے پتے چاندنی میں جھلملا رہے تھے۔ زینو نے اسے بتایا کہ اس نے سارا جزیرہ صاف کیا ہے۔ اب کوئی گرد و غبار نہیں۔ کہیں دھواں نہیں۔ چلتے چلتے ایوا نے پوچھا۔

''تم نے یہ سب کیسے صاف کیا؟''

''میں نے چاندنی کا جھاڑن بنایا اور سارا جزیرہ جھاڑ دیا۔''

''چاندنی کا جھاڑن کیسے بنایا؟''

''ایسے!''

زینو نے ہوا میں چاندنی کا ایک تار توڑا۔ اردگرد کی بہت سی کرنوں کا ایک گُچھا بنا کر تار اُن کے گرد لپیٹ کر گرہ لگا دی۔ پھر اس نے جھاڑن ہوا کے بدن سے اکھاڑ لیا اور اسے آہستہ آہستہ ایوا کی گردن میں پھیرا۔ ایوا کو گدگدی ہوئی۔ اُس نے ہنستے ہوئے دیکھا کہ ہوا کا وہ حصہ جہاں سے کرنیں اکھاڑی گئی تھیں پہلے اندھیرے میں ڈوب گئیں پھر آہستہ آہستہ اس میں کرنیں اگنے لگیں۔

چلتے چلتے وہ جھیل کے کنارے پہنچے تو ایوا نے دیکھا کہ جھیل کا پانی شیشے کی طرح جما ہوا ہے۔ انھوں نے جھیل کے اوپر چلنا شروع کر دیا۔ ایک جگہ ایک لہر جمی ہوئی تھی۔ زینو نے اس منجمد لہر کو ہاتھوں میں پکڑ کر اوپر کھینچا تو وہ قدِ آدم آئینے کی طرف سطحِ جھیل پر ایستادہ

ہوگئی۔ دونوں نے اپنا عکس آئینے میں دیکھا۔ ایوا نے زینو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں تو بادل نخواستہ آج اس کی نظروں کو ٹھوکر نہ لگی۔ اس نے بے اختیار زینو کی گردن میں بانہیں ڈالی۔ ایڑیوں کو بلند کیا۔ پنجوں پر زور ڈالتے ہوئے اس نے زینو کے ہونٹوں کو چوما تو پاؤں کے نیچے جھیل کا شیشہ تڑخ گیا۔ اس سے پہلے کہ ایوا پانی میں اترتی زینو نے اسے اٹھا کر پر شیشے پر رکھ دیا۔ دونوں نے جھیل پر دوڑنا شروع کیا۔ شیشے کے اوپر کنول کے پھول تھے۔ جو دوڑتے ہوئے قدموں کی تھرتھراہٹ جذب کر کے تھرکتے تھے۔ ان کی تھرکن سے شیشے کے نیچے پانی کو ضرب پڑتی تو وہ لہریں دکھاتا تھا۔

جب وہ جھیل سے باہر نکلے تو ایوا کو انتہائی دھیمی گونج سنائی دی۔

''یہ کیا گونجتا ہے زینو؟''

''یہ گردش کرتی کائنات کی گونج ہے۔ یہ وہ گونج ہے جو فیثا غورث سنا کرتا تھا۔ یہ حرکت کرتی ہوئی کائنات کی وہ سمفنی ہے جس کا آہنگ لازوال ہے جس کا ہر سر بے مثال ہے۔''

ایوا نے بے اختیار زینو کے ماتھے کو چوما تو اسے زینو کے سر سے زیتون کے تیل کی ہلکی سی مہک آئی۔

درے سے نکل کر وہ ساحل سمندر پر آئے تو چاند سمندر کے اوپر تھا۔ انھوں نے بائیں پہاڑی پر چڑھنا شروع کیا۔ معلق چٹان پر ایوا کی پشت سمندر کی جانب تھی، وہ چٹان کی آخری حد پر کھڑی تھی اس کی ایڑیاں معلق چٹان سے باہر ہوا میں معلق تھیں زینو نے اسے تھاما ہوا تھا۔ دونوں نے ہوا میں جست بھری۔ ایوا نے اپنے بازو اور ٹانگیں زینو کے گرد لپیٹ دیں۔ دونوں دیر تک نیچے سمندر کی جانب گرتے رہے۔ یکایک گرنے کی رفتار تیز ہوئی۔۔۔ پھر تیز تر۔۔۔ گھبراہٹ سے دل بیٹھنے لگا۔

ہڑبڑا کر ایوا کی آنکھ کھلی تو وہ برٹل کے پہلو میں پشت کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ برٹل

نے عینک اتار کر میز پر رکھی ہوئی تھی اور وہ زیتون کے تیل سے اپنے ماتھے کو سہلا رہا تھا۔ ایوا کو یاد آیا کہ گزشتہ روز برٹل سر درد کی شکایت کر رہا تھا۔ عینک کا فریم برٹل کے چمکتے ہوئے ماتھے پر پھسلا اور کانوں پر جم گیا۔ گول شیشوں سے نظریں ایوا کی آنکھوں میں اتریں۔ برٹل نے اسے چوما اور کہا ''جب بھی تم پشت پر سوتی ہو تو سپنے میں ڈر جاتی ہو۔''

ایوا نے کروٹ بدلی اور برٹل کے گلے میں بانھیں ڈال کر اس کے پہلو میں بھرپور انگڑائی توڑی۔

''یعنی حسینوں کے سب خواب حسین نہیں ہوتے۔ ڈراؤنے بھی ہوتے ہیں!''

برٹل نے اسے چھیڑا تو اس نے اپنا سر اٹھایا۔ اپنا چہرہ برٹل کے چہرے کے برابر رکھا۔ ابھی اس نے جواب دینے کے لیے اپنے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ اسے برٹل کے ماتھے سے زیتون کے تیل کی ہلکی سی مہک آئی۔ اسے اپنا خواب یاد آ گیا اور وہ دوبارہ تکیے پر سر رکھ کر پشت کے بل لیٹ گئی۔

جزیرے پر رہتے ہوئے چار ماہ ہو چکے تھے۔ برٹل نہایت محتاط منصوبہ بندی کے تحت ان دو ہزار سالوں کو زینو سے آشنا کروا رہا تھا جو اس دنیا سے لاتعلقی میں گزارے تھے۔ زینو چلتے ہوئے گفتگو کرنا پسند کرتا تھا۔ اس کے اس معمول کو مدنظر رکھتے ہوئے بات چیت اکثر چلتے پھرتے کی جاتی۔ چہل قدمی بعض اوقات پہروں طوالت اختیار کر جاتی۔

ذمہ داریاں بانٹی گئی تھیں۔ برٹل زیادہ تر سائنسی موضوعات پر زینو سے بات کرتا۔ فنونِ لطیفہ کا شعبہ تحسین کے ذمے تھا۔ ایوا دنیا کی مختلف بڑی زبانوں کے بارے میں بات کرتی۔ برٹل زینو کے بے انتہا ذہانت اور عقل کی رسائی پر اکثر حیرت میں آ جاتا۔ برٹل جیسے شخص کا حیرت زدہ ہونا تو زینو کے غیر معمولی ہونے کی واضح دلیل تھی۔ برٹل نے گزشتہ تین ماہ نہایت سہولت کے ساتھ دو ہزار سالہ سائنسی ارتقا زینو کو بتایا۔ برٹل کو اس بات

پر حیرت ہوتی کہ زینو کو کسی بات پر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ تمام باتیں مدبرانہ شان سے سنتا۔ بعض باتیں سنتے ہوئے وہ رکنے کے لیے کہتا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ یہ بات دوبارہ کہنے کی درخواست کرتا شاید یہی اس کی حیرت تھی۔ یہ زینو کی شخصیت کی دلآویزی تھی کہ اسے ہر بات بتانے کو دل چاہتا تھا۔ زینو کے لیے شاید سب سے بڑی خبر یہ تھی کہ زمین ساکن نہیں بلکہ سورج کے گرد گھومتی ہے۔ زینو کو اس حقیقت پر آمادہ ہونے کے لیے وقت لگا۔ بیسویں صدی کی سائنسی ایجادات زینو نے غور سے سنیں۔ زینو کو اپنا ذہن اس بات پر آمادہ کرنے میں بھی دیر لگی کہ اب تمام علوم اپنی اپنی جگہ الگ اہمیت رکھتے ہیں اور فلسفہ بھی ان میں ایک علم ہے۔ اب تمام علوم کی شاخیں فلسفے کے پیڑ سے نہیں نکلتیں۔ بلکہ علوم کے گلستاں میں فلسفہ ایک علاحدہ درخت ہے اور باقی علوم دوسرے مختلف درخت اور پودے۔ جزیرے میں ہبل ٹیلی سکوپ نصب کی گئی جو زینو کے مشاغل میں زبردست اضافہ تھا۔ کبھی ریڈیو، ٹی وی، ٹیلفون، ہوائی جہاز، آبدوز، خلائی جہاز اور مصنوعی سیارے پر بات ہوتی تو کبھی بین الاقوامی مالیاتی نظام زیر بحث آتا۔ کبھی جدید آلات موسیقی، رقص اور تجریدی آرٹ کا ذکر ہوتا تو کبھی دیس دیس میں بولی جانے والی زبانوں کے صرف ونحو موضوع گفتگو ہوتے۔ تینوں کے درمیان گفتگو انگریزی زبان میں ہوتی۔ ایوا اکثر سناٹے میں آجاتی جب زینو چند دنوں میں انگریزی کے بعد فرانسیسی اور فرانسیسی کے بعد ہسپانوی روانی سے بولنے اور لکھنے لگتا۔ تحسین اور زینو گھنٹوں قدیم اور جدید فنِ سنگ تراشی پر بات کرتے اور شاعری کی گرامر کے اسرار و رموز کھولتے رہتے۔

نیچے پانی ہی پانی تھا اور اوپر آسمان ہی آسمان۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک بہت بڑا نیلے رنگ کا سیپ ہے جس میں پانی بھرا ہوا ہے اور ایک چھوٹا بحری جہاز اس میں تیرتا ہوا چلا جا رہا ہے۔۔۔ ہزاروں سال بعد یہ زینو کا پہلا بحری سفر تھا۔ جہاز میں زینو، برٹل، ایوا،

تحسین اور جہاز کا عملہ تھا۔ دن میں سیپ نیلا ہوتا اور رات کو سیاہ۔ صبح سویرے سرمئی رنگ کا ہوتا اور اس کے ایک طرف سے سورج کا نارنجی موتی اٹھتا جو دوپہر کو گوہرِ آب دار بن جاتا اور شام کو گلابی ہو کر پھٹنے لگتا، پھر ڈوب جاتا۔ شروع میں بحری جہاز کا رخ شمال کی طرف تھا۔

پہلے دن بحری جہاز مالدیپ کے مشرق سے ہوتا ہوا سری لنکا کے قریب سے گزرا اور خلیج بنگال میں داخل ہوا۔ برٹل اور زینو گزشتہ کئی ماہ سے انسانی دماغ کی ساخت اور اس کی کارکردگی پر بحث کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا موازنہ باقی جانوروں سے بھی ہو رہا تھا۔ جب جہاز جزائر اینڈمان کے قریب پہنچا تو برٹل نے محسوس کیا کہ زینو کی بحث میں خلل آ رہا ہے۔ بحری جہاز لنگر انداز کیا گیا۔ زینو جہاز کے عرشے پر کھڑا ہو کر سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس کا رخ بنگال اور چین کی طرف تھا۔ مغرب میں بھارت اور مشرق میں مشرقی ایشیا تھا۔

''سمندر گونجتا ہے۔ یہاں تھرتھرائی ہوئی گونج پھیلی ہوئی ہے۔'' زینو نے کہا۔

برٹل نے بحری جہاز کا رخ موڑ کر جنوب کی طرف کر دیا۔ برٹل جانتا تھا کہ جہاز اگر مزید شمال کی طرف بڑھا دیا گیا تو دنیا کے گنجان علاقوں کی گونج مزید بڑھ کر زینو کی بحث پر اثر انداز ہو گی۔

رات کو آسمان کو طشتری پر چاند کی کٹی ہوئی قاش پڑی تھی۔ نیچے سمندر میں بحری جہاز چراغ کی طرف ٹمٹماتا ہوا بحر ہند کے جنوب اور پھر جنوب مشرق کی طرف بڑھ رہا تھا۔ رات بھیگ چکی تھی۔ جہاز کے ڈرائنگ روم میں برٹل اور زینو پچھلے چھ گھنٹے سے بیٹھے کام کر رہے تھے۔ ڈنر کے بعد ایوا اور تحسین اپنے اپنے کمروں میں سو گئے تھے۔

''تو پھر یہ ثابت ہوا کہ اب تک سائنس دان انسانی دماغ کی بالائی سطح میں زیادہ دلچسپی لیتے رہے ہیں اور جسم کو کنٹرول کرنے والے مراکز کا سراغ اسی سطح پر لگاتے رہے

ہیں۔مگروہ بنیادمرکزتو دماغ کے اندرونی سفید مغز میں نکلا جس کی ہمیں تلاش تھی اور وہ بھی دماغ کے عین مرکز میں،یعنی کارپس کلوزم کے اندر، جو دماغ کے دونوں حصوں کے درمیاں پل ہے۔ یہ مرکز ان تمام مراکز سے براہ راست جڑا ہوا ہے جو دماغ کی سرمئی سطح پر واقع ہیں اور انسان کے حواس خمسہ کو کنٹرول کرتا ہے۔تھیلمس اور ہائپو تھیلمس کے ساتھ براہِ راست منسلک ہے اور مرکز صرف انسان ہی میں پایا جاتا ہے اور کارپس کلوزم کے دریا میں بھنور کی طرح گھومتا ہے۔'' زینو نے کافی کا بچا ہوا ٹھنڈا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔یہی وہ مرکز ہے۔'' برٹل نے کمپیوٹر سے نظریں ہٹائیں اور اپنی پشت کرسی کی پشت پر دبائی۔

اچانک زینو کرسی سے اٹھا اور بولا'' یہاں سمندر بہت گہرا محسوس ہوتا ہے؟''

یہ کہہ کر زینو ڈرائنگ روم سے نکل کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا عرشے پر آیا۔اپنے کپڑے اتار کر جہاز کے فرش پر رکھے اور سمندر مین چھلانگ لگا دی۔اس کے پیچھے پیچھے برٹل باہر نکلا۔زینو کے کپڑوں کو اٹھا کر الماری میں رکھا اور سمندر کا سرمئی سیپ دیکھنے لگا۔ جس کے ایک طرف سے کچھ ہی دیر بعد سورج کا موتی ابھرا، پھر زینو ابھرا اور لچکیلی سیڑھی کے ذریعے جہاز پر چڑھنے لگا۔ برٹل نے گاؤن اس کی طرف پھینکا۔

''سمندر کے ذرا نیچے جائیں تو سناٹے کی سیاہ گونج بتاتی ہے کہ یہاں سمندر بہت گہرا ہے۔'' زینو نے لمبی کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہے۔ہم اس وقت جاوا ٹرینچ کے قریب ہیں جہاں بحر ہند کی گہرائی سب سے زیادہ ہے۔یعنی سوا سات کلومیٹر کے قریب۔''

برٹل نے بتایا۔

''تم نے اس کی تہہ دیکھی ہے؟'' زینو نے پوچھا۔

''نہیں''

’’جب تم اس کی تہہ اپنے کمپیوٹر میں دیکھ لو تو مجھے بھی دکھانا۔ اس کی تہہ میں تقریباً نوے ہزار ٹن سونا ہے پتھروں کی شکل میں۔ یہ سونا ایک بحری کشتی میں لدا ہوا تھا۔ جو خلیج فارس سے روانہ ہوئی۔ ہزاروں سال پہلے، اس کشتی میں کوئی ملاح نہیں تھا۔ اس کشتی کے پیندے میں ایک سوراخ تھا۔ زینو نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

’’تمہاری کشتی بہت دور آ کر ڈوبی اور ڈوبی بھی تو پاتال میں۔ اب سونے کی شکل سمندر کی یخ تہہ میں بھلا کیسی ہوگی؟‘‘

’’جیسی سونے کی ہوتی ہے۔‘‘ زینو نے کہا۔

برٹل اور زینو کی یہ گفتگو روشنی کی رفتار سے سفر کرتی ہوئی خلا میں نگراں اس مصنوعی سیارے میں داخل ہوئی جو ہر وقت برٹل کی حفاظت پر مقرر تھا۔ مگر یہ گفتگو نہایت خصوصیت کے ساتھ سنی گئی اور فوراً نیویارک اور یروشلم میں پہنچائی گئی۔ ابھی برٹل اور زینو عرشے پر ہی تھے کہ جہاز کے اندر ایوا کے کمرے میں اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ ایوا نے انگوٹھے کی پور سے موبائل آن کیا تو ناخن پر دبے ہوئے نیم خوابیدہ خون نے گلابی قوس بنائی۔

’’ایوا‘‘ ایوا کی آواز میں بیدار ہونے والی پہلی آواز کی ہسک تھی۔ فون پر مختصر بات کی گئی۔ سوہ ہڑ بڑا کر اٹھی اور سیڑھیاں چڑھ کر عرشے پر آئی۔ نائٹ سوٹ کے کھرے کے نیچے اس کے جسم کا گلاب دمک رہا تھا۔ جہاز کی ریلنگ پر ہاتھ رکھے برٹل اور زینو سمندر کی جانب دیکھ کر گفتگو کر رہے تھے۔ زینو کے ہلکے گھنگھریالے بال بھیگ کر زیادہ گھنگھریالے ہو چکے تھے۔ ایوا ان کے قریب پہنچی۔ برٹل زینو سے کہہ رہا تھا۔

’’۔۔۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے بین الاقوامی معیشت گولڈ سٹینڈرڈ پر خوش اسلوبی سے چل رہی تھی۔ مگر جنگ میں سرمائے کی ضرورت کئی گنا زیادہ ہوگئی چنانچہ سرمایہ جنونی حد تک بڑھا کر افراط کا طوفان کھڑا کیا گیا۔ یوں کہ گولڈ سٹینڈرڈ خس وخاشاک کی طرح اڑ گیا۔ قصور سونے کے معیار کا نہیں تھا سرکاری قوانین کا تھا جس نے دنیا کی معیشت کے

بخیے ادھیڑ دیئے۔اب بھی حکومتوں اور لوگوں کے پاس بہت سونا ہے۔''

''کتنا ہے؟'' زینو نے اپنے گیلے بالوں پر انگلیوں کی کنگھی پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''ورلڈ گولڈ کونسل کے مطابق ساری دنیا میں ایک لاکھ پینتالیس ہزار ٹن سونا ہے۔ ہر سال سونے کی مقدار میں تین یا چار فیصد اضافہ ہوتا ہے۔سب سے زیادہ سونا امریکہ کے پاس ہے،اس کے بعد جرمنی اور آئی ایم ایف کے پاس۔سونے کے سب سے زیادہ زیورات بھارت میں بنتے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کس شخص کے پاس سب سے زیادہ سونا ہے۔ساری دنیا کا سونا ایک جگہ جمع کریں تو پچیس مکعب میٹر جگہ گھیرے گا۔''

''سونا بھی عجیب دھات ہے۔ ہزار ہا سال پہلے بھی سونا ایک جنون تھا۔آج کے دور میں ہیجان بن گیا ہے۔قدیم دور میں یونانیوں سے زیادہ مصری لوگ بڑے زرگر تھے۔ وہ سونے کو کوٹ کوٹ کر اتنا باریک پتہ بناتے تھے کہ تین لاکھ پتے اوپر تلے دھریں تو موٹائی انگلی کی پور کے برابر ہوتی تھی۔۔۔''

''زینو نے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت اٹھائی تو ایوا نے دیکھا کہ نئے دن کا سورج زینو کے ہاتھ کے پس منظر میں کوٹ کر باریک کیے ہوئے گول پتے کی طرح چمک رہا ہے۔''

''بحیرۂ آژ میں ایک جزیرہ تھا، جہاں زمین کے نیچے اتنا سونا تھا جتنے زمین کی سطح کے اوپر پتھر۔وہاں ایک کمرہ سونے سے بھرا رہتا تھا۔ بہت زیادہ سونا اگر کمرے میں پڑا ہو تو اس کی ایک مخصوص بو ہوتی ہے۔اگر سمندر میں ہو تو مخصوص لہریں دیتا ہے جو غوطہ لگانے والے کے جسم پر دستک دیتی ہیں۔'' زینو نے برٹل سے کہا تو برٹل مسکرایا اور پوچھا۔

''سونے کی بو کیسی ہوتی ہے؟''

''سونے جیسی ہوتی ہے۔۔۔پیلی ہوتی ہے، زینو نے جواب دیا اور برٹل سے

کہا۔

''کیا میل ہا میل گہرائی سے تم یہ سونا نکال سکتے ہو؟''

''چاہیے؟'' برٹل نے شریر لہجے میں پوچھا تو زینو نے قہقہے کا تیر سمندر کی فضا میں چھوڑا جس کی نوک سونے کی تھی اور جس کی دم کے گرد سونے کا پتر الپٹا ہوا تھا۔ساتھ ہی برٹل نے قہقہے کی کوہی ابابیل اس تیر کے تعاقب میں چھوڑی اور کہا'' جب تمھیں برف سے نکالا گیا تو تمہارے لباس کے ساتھ تین پوٹلیاں تھیں۔ایک میں پانی تھا، دوسری میں خشک پھل اور تیسری میں عمل والی مٹی ۔وہ مٹی جو کشش ثقل کو زائل کرتی ہے اگر اس عمل والی مٹی میں سے آواز کی لہریں گزار کر سمندر کی تہہ میں پھینکی جائیں تو الٹرا سونک لہریں سونے کے پتھروں پر پڑ کر کیا عمل کریں گی؟''
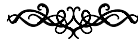
باب ششم

ان دنوں عالمی مالیاتی ادارے کی ایک اہم کانفرنس ہانگ کانگ میں ہو رہی تھی۔ کانفرنس کا ایجنڈا تھا:

''سیاسی کیمیا گری نے دنیا کی معیشت کو سونے کے معیار سے تبدیل کر کے کرنسی نوٹوں اور بینک سرٹیفکیٹوں کی شکل دے دی ہے۔ گزشتہ صدی کی عالمی جنگوں نے بین الاقوامی معیشت کو ایک نئی نہج پر لا کھڑا کیا ہے۔ ان جنگوں سے پہلے ڈالر گولڈ سٹینڈرڈ پر بخوبی پرورش کر رہا تھا مگر جب سے گولڈ سٹینڈرڈ ختم ہوا ڈالر مسلسل افراط زر کا شکار ہے اور پاتال میں گر رہا ہے۔ اگرچہ یورو کا ظہور پذیر ہونا اور جاپانی معیشت کا ترقی کرنا ایک خوش آئندہ عمل ہے، مگر تیسری دنیا کے مظلوم عوام مسلسل قرضے کی چکی میں پس رہے ہیں۔ غریب ملکوں کی اس بے حالی پر ترقی یافتہ قوموں کے معیشی دانشور نہایت بے چین ہیں۔ چنانچہ وہ وقت آ چکا ہے کہ بریٹن وڈ اداروں کی تعمیر نو کی جائے تاکہ دنیا معیشت کی نشاۃِ ثانیہ سے روشناس ہو سکے۔ آئی ایم ایف نہایت سنجیدگی سے اس پہلو کا جائزہ لے رہی ہے۔ کیوں نہ عالمی

معیشت کا تعین از سر نو گولڈ سٹینڈرڈ پر کیا جائے مگر یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ عالمی معیشت اتنی گنجلک ہو چکی ہے کہ تمام کرنسیوں کو گولڈ سٹینڈرڈ پر لانا کوہِ گراں کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے لیے ہمیں برطانوی بادشاہت کی معیشت کا تجزیہ بھی کرنا پڑے گا جب نپولین کی جنگوں کے دوران سونے اور پاؤنڈ کے تناسب میں نشیب وفراز آتا رہا۔ ہمیں اس سونے اور ڈالر کے تناسب کی کوئی راہ نکالنا پڑے گی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا سونے کی خرید وفروخت عالمی منڈیوں میں آزاد کر دی جائے اور ساتھ ہی دنیا بھر کی کرنسیوں کو مارکیٹ کے تیوروں کے حوالے کر دیا جائے۔ کیا اس طرح ڈالر اور باقی کرنسیوں کی قیمت میں استحکام آجائے گا اور کیا پھر سے تمام کرنسیاں سونے کے معیار سے منسلک ہو کر بین الاقوامی معیشت کو راہ راست پر لے آئیں گی۔ انسان بہت ترقی کر گیا ہے۔ یہ بات غلط ہے کہ دنیا میں سونے کی کمی ہے۔ قدرت نے کرۂ ارض کو سونے کے ناقابل یقین ذخائر سے نوازا ہے۔ آیئے اس خزانے سے مستفید ہو کر دنیا کی معیشت کی کایا پلٹ دیں۔''

دنیا بھر سے ہندسوں کے جغادریوں اور معاشیات کے پنڈتوں کے جتھے شہر میں آچکے تھے۔ شہر کا ایئرپورٹ جو پہلے ہی بہت مصروف تھا، آج کل ہانپتا ہوا نظر آتا تھا۔ شیشے کی طرح چمکتے ہوئے ایئرپورٹ پر ہوائی جہاز ہر طرف سے پرندوں کی طرح اتر رہے تھے۔ اپریل کا مہینہ تھا اور بارشوں کا زور۔ جب اترتے ہوئے گیلے جہاز سیاہ رن وے کو چھوتے تو جھک کی آواز آتی اور جب پرواز کرتے تو ان کی بیضوی کھڑکیوں کے شیشے اندھے ہو جاتے اور ان پر پانی کی پتلی لکیریں چلنے لگتیں۔

پال بہت جلدی میں تھا اسے کانفرنس میں شام کا سیشن بھگتانا تھا۔ وہ اس وقت چائنا ریسورس سنٹر کی چالیسویں منزل پر تھا۔ اوپر آسمان پر شام ہونے میں کچھ وقت تھا مگر نیچے ہانگ کانگ کی گلیوں میں آسمان کو چھوتی ہوئی عمارتوں نے شام کر دی تھی۔ چائنا

ریسورس سنٹر کے گراؤنڈ فلور پر کھڑے زینو نے دیکھا کہ لفٹ نے چالیس نمبر کی لائٹ روشن کی ہے۔ زینو سفید سوتی پینٹ اور سلیٹی رنگ کی سپورٹس شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ زینو کے کپڑے ابھی تک پاکستان سے بن کر آتے تھے۔ چولستان کی ملحقہ زمین پر اُگی ہوئی کپاس چنی جاتی اور لائل پور کی کھڈیوں پر زینو کا لباس تیار ہوتا۔ زینو کے لباس کی ذمہ داری بھی تحسین کے ذمہ تھی۔ تحسین کے بنوائے ہوئے لباس کے علاوہ جب بھی زینو کوئی اور کپڑا پہنتا تو اس کے جسم پر تازیانوں جیسے سرخ نشان پڑتے تھے۔

ملائم گھنٹی بجی اور گراؤنڈ فلور پر لفٹ کا دروازہ کھلا۔ پال اکیلا لفٹ سے اترا تو زینو کے ساتھ کھڑے ایک سیاہ فام شخص نے پال سے ہاتھ ملایا جس نے اپنے دائیں کان میں چھوٹی سی بالی اور بائیں پہلو میں ایک فلپائنی عورت پرور کھی تھی۔ اس سیاہ فام شخص نے صرف پانچ سیکنڈ میں سٹاک ایکسچینج کی پوزیشن پال کے سامنے یوں پیش کی جیسے کوئی مینڈک ٹرا رہا ہو۔ سیاہ فام شخص کی اس کارکردگی کے زیرِ اثر بائیں جانب فلپائنی عورت تھرتھراتی رہی اور دائیں کان کی بالی میں عمارت کی روشنیاں جلتی بجھتی رہیں۔

''ہوں۔۔۔'' پال نے سیاہ فام خبر رساں کو جواب دیا اور چلنے لگا۔ تین قدم کے فاصلے پر زینو کھڑا تھا۔ پال نے ایک قدم اٹھایا، رکا اور نظریں فرش سے اٹھا کر زینو کے چہرے پر رکھیں، دونوں نے ایک دوسرے کو بھرپور انداز میں دیکھا۔ زینو کو وہ وقت یاد آیا جب اس نے پہلی بار سکندر کو دیکھا تھا۔ اس وقت بھی شام تھی۔ ارسطو اور زینو اپنی دھن میں محو چلتے جا رہے تھے کہ انھیں گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ مڑ کر دیکھا تو انھیں چند گھڑ سوار نظر آئے جو ان کے قریب آ کر رک گئے۔ سکندر چند سپائیوں کے ساتھ علاقے کے گشت پر تھا۔ اس نے ارسطو کو دیکھ کر اپنا ہاتھ بلند کیا۔ ارسطو نے جواب دیا۔ شام کے دھندلکے میں سکندر نے زینو کو دیکھا۔ وہ کچھ دیر زینو کو دیکھتا رہا اور اس دوران سکندر کا سیاہی مائل خاکی گھوڑا اپنے سموں کی دھیمی لچک سے اس کا جسم اپنی ننگی پشت پر اچھالتا

اور گراتا رہا۔

پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے پال اور زینو ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

پال نے اپنا بایاں ہاتھ سیاہ پتلون کی جیب سے نکالا اور کوئی کلائی گھما کر گھڑی نظروں کے سامنے کی تو اس کی سفید شرٹ کہنی کے قریب سلوٹیں کھا گئی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پال سڑک اور پل پار کر کے سمندر کنارے اس جگہ پہنچا جہاں سے اسے فیری پر بیٹھنا تھا جو ہانگ کانگ اور کولون کے درمیان چلتی تھی۔ ہلکی بارش سے پال کی قمیص گردن سے نیچے کمر پر چپک کر گلابی ہوگئی جب کہ قمیص کا نچلا حصہ بنیان کی رکاوٹ نے مزید اجلا کر دیا۔ فیری میں ہر رنگ ونسل کے لوگ لہروں کے زور پر جھولتے ہوئے جا رہے تھے۔ کچھ کھڑکیوں کو بند کرنے کے لیے پولی تھین چڑھائی گئی تھی جن پر بارش گر کر آواز دیتی تھی۔ دس منٹ کا یہ سمندری سفر پال نے بے چینی میں گزارا اور بار بار گھڑی دیکھی۔ فیری سے اتر کر پال نے پینن سولا ہوٹل کا رخ کیا جہاں کانفرنس اس کی منتظر تھی۔ پال بین الاقوامی شخصیت تھا۔ اسرائیل ہو یا امریکہ، برطانیہ ہو یا فرانس، جرمنی ہو یا جاپان وہ ہر جگہ معزز ترین شہری تھا۔ وہ فنانس اور معاشیات کے میدان میں ید طولیٰ رکھتا تھا مگر ہمیشہ پس منظر میں رہ کر دنیا کی اقتصادیات کی نوک پلک درست کرتا تھا۔ وہ ہوٹل کے صدر دروازے میں داخل ہوا چاہتا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی:

''پال''

وہ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ ایڑیوں پر گھوما۔ زینو پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔ ایک چھوٹا سا خاکی رنگ کا بیگ اس کے کاندھے سے لٹک رہا تھا۔

''میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ ساری دنیا میرا انتظار کر رہی ہے۔'' پال نے ہوٹل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑی تیزی سے کہا۔

''ساری دنیا؟؟؟'' پال کے اس خطابیہ انداز پر زینو کو سکندر یاد آیا، جو ایک دن

ایک کوچے میں ہومر کی شاعری رزمیہ انداز میں پڑھ رہا تھا۔

''۔۔۔مگر بہادر کی جلد رنگت نہیں بدلتی

اگر وہ برچھیوں کے پیہم وار سے گھائل ہو بھی جائے

تو بھی کوئی ہتھیار اس کی گردن کی پشت اور پیٹھ کو چھلنی نہیں کر سکتا

۔۔۔۔ہاں! اس کے سینے اور شکم کو پھاڑ سکتا ہے۔۔۔۔''

''ساری دنیا؟ ساری دنیا کبھی کسی کا انتظار نہیں کرتی پال!'' زینو نے اسے بتایا۔

پال خاموش رہا۔

''میرے ساتھ چلو'' یہ کہہ کر زینو مڑا اور چم شا چوئی کی شاہراہ میں داخل ہوا جو پینن سولا ہوٹل کے ساتھ ہی بائیں جانب تھی۔ ذرا آگے زیر زمین ریل کا بل تھا۔ جس میں سے لوگ چیونٹیوں کی طرح نکل رہے تھے۔ وہ لوگ تھے جنھیں ابھی ابھی ریل کا لاوا اگل گیا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد زینو دائیں جانب تاتھن روڈ پر مڑا تو پیچھے سے پال نے آواز دی:

ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''یہی بات تو تم سے پوچھنا ہے! تم کہاں بیٹھ کر بات کرنا چاہتے ہو؟''

پال نے ہالیڈے اِن کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں اس کے ریستوان مین داخل ہوئے۔ ہوٹل کے منیجر نے ایک علیحدہ کونے میں ان کے بیٹھنے کا اہتمام کیا۔

''تم کیا کرتے ہو؟'' زینو نے بات کا آغاز کیا۔

''میں۔۔۔!

میں معاشیات کرتا ہوں۔۔۔

میں اقتصادیات کرتا ہوں۔'' جواب آیا۔

''خوب کرتے ہو۔ پرانے لوگ فلسفہ کرتے تھے اور اسی میں سب کچھ کرتے تھے۔ آج کے لوگ معاشیات کرتے ہیں اسی میں سب کچھ کرتے ہیں۔ اگر چہ طبیعات،

کیمیا اور طب بھی بہت ترقی یافتہ علوم ہیں مگر معاشیات کو آج کے دور کا سب سے بڑا علم سمجھا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ تو یہ بتاؤ کہ معاشیات دراصل ہے کیا؟'' زینو نے پال کے موبائل فون کو دیکھتے ہوئے کہا جو میز پر دھرا تھا۔

''یہ وہ علم ہے جو تجزیہ کرتا ہے کہ کیسے انسان کی لامحدود خواہشات کو مطمئن کرنے کے لیے محدود وسائل کو عمل میں لایا جائے۔'' پال نے معاشیات کی تعریف کی۔

''کیا وسائل محدود ہیں؟'' زینو نے پوچھا

''جی ہاں''

''میرا خیال ہے کہ وسائل محدود نہیں ہیں'' زینو نے کہا تو پال نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''انسان کی خواہشات لامحدود کیوں ہیں؟'' زینو نے پوچھا۔

''یہ انسانی نفسیات کا ماہر بہتر بتائے گا یا کوئی فلسفی۔'' پال نے جواب دیا۔

''سرمایہ دارانہ نظام معیشت ایک ایسا نظام ہے جس کی عمارت آزادی کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ یعنی سرمایہ کاری کی آزادی، صنعت وحرفت کی آزادی، مقابلے اور مسابقت کی آزادی اور خرید وفروخت کی آزادی'' پال نے کہا۔

''مکمل آزادی!؟'' زینو نے کہا۔

''ہاں ۔۔۔! کہہ سکتے ہیں لیکن مادر پدر آزادی بھی کسی سسٹم کے لیے موزوں نہیں ہوتی۔ اس طرح نظام بے لگام ہو جاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی قدغن چاہیے لیکن کم سے کم۔ اس قدر کہ نظام بھی آزادانہ چلتا رہے اور کچھ قواعد بھی متعین کردیئے جائیں کہ بہاؤ کو کناروں میں رکھیں۔ کنارے بنانے کا کام حکومت انجام دیتی ہے۔ اجارہ داری کی روک تھام کے لیے، تمام سرمایہ داروں کو یکساں مواقع فراہم کرنے کے لیے، ٹیکس کا نظام فعال بنانے کے لیے تاکہ حکومت کے اپنے اخراجات بھی پورے ہوتے رہیں۔'' پال نے بیئر کا

گھونٹ بھرا۔

''آزادی سے تمہاری کیا مراد ہے؟ خلا میں آزاد سیارے، کرہ ارض میں آزاد ہوا، سمندر میں آزاد وہیلیں، دریا میں آزاد مچھلیاں ،شہر میں آزاد شہری، قید خانے کی دیواروں میں آزاد قیدی!'' زینو نے پوچھا۔

''دیکھئے!'' پال نے کندھے اٹھا کر، بازو اور ہونٹ پھیلا کر اور آنکھیں سیکڑ کر کہا۔'' یہ ایک سیاسی موضوع ہے اور میں معاشیات کا آدمی ہوں۔ اس لیے موضوع پر کوئی خاص بات نہیں کر سکتا۔ آزادی کی اقسام اور درجہ بندی اس شعبے کا ماہر بہتر بتا سکتا ہے البتہ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ آزاد معیشت کو حکومت کی کچھ پابندیوں کے زیر سایہ پروان چڑھنا چاہیے تا کہ ایک نظم وضبط فروغ پائے اور حکومت کی زیر نگرانی مقابلے کی سازگار فضا قائم ہو۔''

''جب ایک صنعت دوسری صنعت سے مقابلہ کرتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟''

''مقابلہ ہوتا ہے۔'' پال نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تو کیا ہوتا ہے؟'' زینو نے پھر پوچھا۔

''ایک صنعت آگے نکل جاتی ہے۔'' پال نے کرسی پر ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

زینو نے بات بڑھائی'' اور دوسری پیچھے رہ جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا منافع کم ہو جاتا ہے۔ جو ایک بحرانی کیفیت ہے، منافع کم ہو جاتا ہے تو لاگت گھٹانے کی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں جس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ مزدور کم کیا جاتا ہے۔ اس طرح بحران عارضی طور پر ٹل جاتا ہے۔ مگر یہ بحران پھر عود کر آتا ہے۔ جب تک کوئی نئی اختراع نہ کی جائے اور مدمقابل صنعت سے دو قدم بڑھ کر کوئی تدبیر نہ کی جائے ، بحران کا یہ چکر چلتا رہتا ہے، جب ایک صنعت بحران کے اس فاسقانہ چکر میں پھنستی ہے تو اس وقت صنعت کار کی ذہنی کیفیت کیا ہوتی ہے اور مزدور دماغی بحران کی کس منزل پر کھڑا ہوتا ہے؟''

دیکھئے!'' پال نے کھلا ہوا ہاتھ بلند کر کے گفتگو کا ریلا روکنے کی کوشش ''یہ سوال آپ کسی ماہرِ نفسیات یا ماہرِ عمرانیات سے کیجیے۔''

زینو نے کچھ توقف کیا اور پھر پوچھا:

''سرمایہ داری نظام کو اگر مذہب تصور کیا جائے تو اس کا خدا کون ہے؟''

پال نے ہنستے ہوئے جواب دیا:

''اول تو اس نظام کو مذہب تصور ہی کیوں کیا جائے کیونکہ یہ ایک خالصتاً معاشی نظام ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں مذہبی علوم کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں لادین ہوں۔''

''جس طرح لوگوں نے مذاہب کی بنیاد خوف پر رکھ دی اس طرح سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد خوف پر رکھ دی گئی ہے۔ اگر خوف مذہب ہے اور خوف سرمایہ داری نظام ہے تو قیاس منطقی رو سے سرمایہ دارانہ نظام مذہب ہے۔ جس طرح مذہب کا خدا ہوتا ہے اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام کا خدا ہوتا ہے اور خدا کا نام منافع ہے۔ منافع کی پوجا اور منافع گرنے کا خوف۔۔ تمہارے مذہب کی ساری کہانی ان آٹھ الفاظ میں مضمر ہے۔

شہنشاہیت ،ملوکیت ،سامراجیت، استعماریت نو آبادیاتی نظام ۔۔حکومت کرنے کی مختلف شکلیں شاید ہوں یا نہ ہوں مگر منافع حاصل کرنے کی شکلیں بہر حال ہیں۔ عالمگیریت یا ہمہ ارضی ۔۔۔ترقی کی شکلیں ہوں یا نہ ہوں مگر منافع حاصل کرنے کی شکلیں بہر حال ہیں۔ منافع چاہیے خواہ معاشرے تباہ ہو جائیں۔ منافع چاہیے چاہے تہذیبیں مٹ جائیں۔ منافع پر پختہ ایمان ہی خداوندِ سرمایہ کاری کی رضا ہے۔ یہی تمہارا مذہبی نصب العین ہے۔ تم نے کہا تھا کہ تم لادین ہو جبکہ تم سے بڑا مذہبی کرۂ ارض پر اور کوئی نہیں کیونکہ موجودہ نظام کی ساری باگ دوڑ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ خوف کے زیرِ اثر سرمایہ کاری ،شہوانی، بحرانی، ہیجانی اور جنونی کیفیات سے گزرتا ہے۔ شہوانی جوش و خروش سے سرمایہ لگایا

جاتا ہے تو ایسی صنعت وجود میں آتی ہے جو منافع دے سکے اور مختلف صنعتوں کے درمیان تگ ودو مقابلے، مسابقت اور رقابت کی جنگ میں آگے بڑھنے کا جذبہ فراہم کر سکے۔ یہ شہوانی شدت معاشروں کی مختلف تہوں میں سرایت کرتی ہے۔ جبھی تو آج تک کے دور میں جنسی بے راہروی عام ہے۔ جنسی اختلاط کے مختلف انداز ٹی وی کے شیشے اور سینما کے پردہ سیمیں پر اسی جذبے کے تحت پیش کیے جاتے ہیں۔ اب بحرانی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ تمام دنیا میں معاشی بحران کا مدوجزر اسی وجہ سے مچلتا ہے۔ پیچھے رہ جانے والی صنعت میں منافع زوال کی طرف رجوع کرتا ہے۔ منافع کی یہ کمی اور انحطاط خوف کو مہمیز دیتا ہے۔ منافع کا زوال جب خسارے کی طرف گامزن ہوتا ہے تو لاگت گھٹانے کی تدبیر اختیار کی جاتی ہیں۔ لاگت گھٹانے کا سودا سر میں سماتا ہے۔ اب ہیجان نمودار ہوتا ہے۔ مزدوروں کی فوج کو کم کر کے بیروزگاری کے فروغ میں حصہ ڈالا جاتا ہے۔ ہیجان کی ہوا چلتی ہے تو تقریباً تمام ذہنوں کو چھوتی ہے اور لاشعور میں سرایت کر جاتی ہے۔ کیا تم آج کل کے لوگوں کو گاتا ہوا نہیں سنتے؟ کیا وہ گاتے ہیں یا چیختے ہیں؟ کیا تم آج کل کے لوگوں کو ناچتا ہوا نہیں دیکھتے؟ کیا وہ ناچتے ہیں یا تڑپتے ہیں؟ لاگت کم ہونے سے وقتی طور پر بحرانی کیفیت کو لگام دی جاتی ہے مگر یہ غیر ممکن ہے کہ بغیر کسی نئی صنعتی اختراع کے ترقی ممکن ہو سکے۔ جنون کے شعلے کو ہوا دی جاتی ہے۔ نئی نئی اختراعات وجود میں آتی ہیں اور لوگوں کو پبلسٹی کے ذریعے باور کروایا جاتا ہے کہ نئی مصنوعات کے بغیر ان کی زندگی ادھوری ہے۔ لوگوں کی اکثریت سادہ ہے۔ یہ اکثریت ہمیشہ سے سادہ رہی ہے جسے جنونی ذہن اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ پبلسٹی اور اشتہار بازی کی رنگین بھرمار میں لوگ واقعی مان لیتے ہیں کہ نئی مصنوعات کی ایجاد کے بغیر ان کی زندگی ادھوری ہے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ان کی ایجادات سے پہلے بھی وہ زندہ تھے، جی رہے تھے۔ کیا تم جنون کی وباء کو دنیا میں پھیلتا ہوا نہیں دیکھتے؟ کیا روز بروز ذہنی مریضوں کی تعداد میں اضافہ نہیں ہو رہا؟

خون کے کئی رنگ ہوتے ہیں۔تازہ زخم سے رستا ہوا گرم سرخی مائل خون۔ جما ہوا بد بودار سیاہی مائل خون۔پانی پر پھیلا ہوا معلق گلابی خون یا پھر گھوڑوں کے سموں کے نیچے مسلا ہوا مٹی ملا خون جس میں کچلے ہوئے گھاس کی بو مل کر فضا کو عزاداری کی طرف مائل کرتی ہے۔خوف کے بھی کئی رنگ ہوتے ہیں۔آنکھوں سے ابلتا ہوا خوف، چہرے کے مساموں سے رستا ہوا خوف،خون میں ایڑ لگا کر دوڑتا ہوا خوف،جسم کپکپاتا ہوا خوف یا جسم کو پتھر بناتا ہوا خوف۔۔۔تمھارے ہاں سرمایہ دار بھی خوف زدہ ہے اور مزدور بھی۔ بیروزگاری کا خوف مزدور کو مجبور کرتا ہے کہ وہ صنعت کاری میں اپنا پسینہ شامل کرے کیونکہ کارخانہ چلے گا تو اس کا نظامِ حیات چلے گا۔سرمایہ کار کو اس زمین کا خوف ہے جس پر منافع پاؤں دھرتا ہے۔ مبادا زمین شق ہو جائے کہیں پتوں سے ڈھکا ہوا کنواں راہ میں نہ آ جائے۔۔۔کہیں کانٹا نہ چبھ جائے۔

سرمایہ دار خوف کے زیر اثر اختراعات اور تنوع پر تکیہ کرتا ہے تو اس کے ملازم ان اختراعات سے بنی ہوئی چیزوں کے حصول پر۔غیر ترقی یافتہ اور غریب علاقوں کے لوگ نئی مصنوعات کے حصول کے لیے دیوانے ہو جاتے ہیں۔وہ امیر بننے کا خواب آنکھوں اور کبھی واپس نہ آنے کا عزم دل میں لیے قانونی یا غیر قانونی ذرائع سے امیر علاقوں میں وارد ہوتے ہیں تاکہ وہ نئی سے نئی مصنوعات کو پہلے استعمال کر کے غریب لوگوں کو حقارت یا برتری سے دیکھ سکیں۔اس طرح تمھارے دور کی اکثریت اپنی نرگسیت کی تکمیل کرتی ہے۔ ہر کسی کے اپنے اپنے نرگسی مسائل ہیں اور کارخانے نے ان ذہنی مسائل کا حل اپنی مصنوعات کی شکل میں بیچتے ہیں۔جنھیں خرید کر ذہنی مریض پانی کے آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہیں اور اپنے ہی حسن پر فریضتہ ہو جاتے ہیں۔

پال!تم نے جنونی حالت میں زمین کو بے دریغ خرچ کیا ہے۔نوچ نوچ کر اس کے اندر سے وہ کچھ نکالا ہے جس کی ضرورت نہیں تھی۔کیا میں اسلحہ سازی کی بات کروں؟

موت کے سوداگروں، قہر کے دکانداروں اور بربادی کے ذخیرہ اندوزوں کی بات کروں؟ مخبوط الحواس کارخانے داروں، جذباتی بلیک میلروں اور ذہنی مشینوں کا ذکر کروں؟

تم بڑے فضول خرچ ہو۔ زمین کو بڑی تیزی سے خرچ کررہے ہو۔ تم اس مخبوط الحواس شخص کی مانند ہو جس کے پاگل پن سے بےزار ہو کر گھر والوں نے اسے ایک کمرے میں بند کر دیا ہے اور سالہا سال سے وہ شخص ایک ہی کمرے میں مقید ہے۔ فرش کی مٹی اکھاڑتا ہے، دیواروں پر خراشیں ڈالتا ہے، اسی کمرے میں کھاتا ہے۔ اسی میں رفع حاجت کرتا ہے، جس دیوار سے سر ٹکراتا ہے اسی دیوار سے لگ کر سو جاتا ہے۔۔۔ یہ تم نے زمین کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ تم نے زمین اور اس کی فضا کو بہت میلا کر دیا ہے۔ اتنی گندگی اچھالنے سے پہلے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ زمین سے نکلا ہوا کوڑا کرکٹ آخر کہاں پھینکا جائے گا۔۔۔ چاند پر؟ اور پھر چاند پر کیوں؟ زمین کی سزا چاند کو دینا کہاں کا انصاف ہے؟

تمہاری معیشت اس بےلگام گھوڑے کی طرح ہے جو اپنے گھڑسوار سے بےخبر سرپٹ دوڑ رہا ہے۔ گھڑسوار ہچکولوں سے بچنے کے لیے گردن سے لپٹتا ہے تو ہاتھ پھسلتے ہیں۔ ایال پکڑتا ہے تو بال اکھڑ کر مٹھیوں میں آتے ہیں۔ جھٹکا لگتا ہے تو گھڑسوار پشت کے بل زمین پر گرتا ہے یوں کہ پاؤں رکاب میں پھنسا رہ جاتا ہے۔ جب حکومت کرنسی کی مقدار کم کرتی ہے اور شرح سود گھٹاتی ہے تو افراط زر گرتا ہے مگر بےروزگاری بڑھتی ہے اور کارخانے ویران ہو جاتے ہیں۔ اگر کرنسی کی مقدار بڑھتی ہے تو افراطِ زر بڑھتا ہے۔ درآمدات اور برآمدات کا توازن بگڑتا ہے۔ تمہاری معیشت میں گردشِ زر بےقابو ہے۔ تمہاری کتابیں کہتی ہیں کہ قومی آمدن اور سرمائے کی مقدار میں توازن ہونا چاہیے۔ مگر مکمل روزگار فراہم کرنے کے بہانے اس توزان کو توڑا جاتا ہے۔ سرمائے کے پھیلاؤ کو روکنا تمہارے لیے ناممکن ہے۔ تمہارے بین الاقوامی مالیاتی ادارے اس لیے وجود میں آئے

تھے کہ دنیا میں معاشی ترقی کا توازن ہوگا۔مگر ایسا کہاں ہوا۔ چند ملکوں میں ترقی ہوئی جبکہ باقی دنیا کا توازن بگڑ گیا۔تمہاری کتابیں اور قوانین کچھ اور کہتے ہیں جبکہ تمہارا طریقۂ واردات کچھ اور ہوتا ہے۔کبھی یہ نظریہ پیش کیا جاتا ہے کہ ٹیکس بڑھانے سے قومی خزانہ بڑھے گا تو کبھی یہ تھیوری سامنے آتی ہے کہ ٹیکس کم کرنے سے قومی خزانہ بڑھے گا۔کبھی معاشی تنزل سے افراطِ زر بڑھتا ہے۔

انتشار کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ تمام علوم الگ الگ دنیاؤں میں پروان چڑھ رہے ہیں اور ایک کی کارکردگی سے دوسرا بے خبر ہوتا ہے۔معاشیات الگ ہے تو عمرانیات الگ،طبیعات ایک طرف ہے تو کیمیا دوسری طرف، سیاست ایک طرف ہے تو اخلاقیات۔۔۔۔مگر اخلاقیات تو سرے سے ہی مفقود ہے یہ تمام سائنسیں الگ الگ کارکردگی کرتی ہیں۔ پرانے دور میں یہ سب سائنسیں فلسفے کا حصہ ہوا کرتی تھیں مگر آج یہ کون سے ڈسپلن کا حصہ ہیں؟ ترقی کا مقصد یہ نہیں کہ تمام علوم بے لگام ہو جائیں۔ جب کسی سسٹم کا محور اور مدار متعین نہیں ہوتا تو نتیجہ انتشار کی شکل میں سامنے آتا ہے۔معاشیات آج کے دور کا بڑا علم ہے۔کیا یہ ضروری نہیں کہ اس علم میں اخلاقیات کا رنگ بھی شامل کر لیا جائے جو عالمی معیشت کا نصب العین متعین کرے۔ یہ افلاطون کا نظریہ تھا۔اگر تم افلاطون کو نہیں مانتے تو آئن سٹائن کو تو مانتے ہوگے۔آئن سٹائن نے کہا تھا کہ فلکیات اور سوشلزم اگرچہ الگ الگ عموم نظر آتے ہیں مگر ان کی بنیاد ایک ہے۔دونوں علوم قوانین پر مبنی ہیں اور قوانین کا موازنہ ممکن ہے۔اگر یہ دونوں بظاہر مختلف علوم ایک نظر سے دیکھے جاسکتے ہیں تو عالمی معیشت کے اس گھوڑے پر اختلافیات کی زین کیوں نہیں کسی جاسکتی جو پاگلوں کی طرح دوڑ رہا ہے اور جس کی سموں سے چنگاریاں اڑ اڑ کر منظر جھلسا رہی ہیں۔اگرچہ محکمہ شماریات کے اپنے مسائل ہیں اور ان کے اعداد و شمار پارے کی طرح تھرکتے رہتے ہیں مگر پھر بھی شماریات نے کافی کام آسان کر دیا ہے۔اعداد و شمار کی زبان میں موجودہ دور کی کہانی

نہایت سادہ مگر انتہائی دردناک ہے۔کہانی کچھ یوں ہے کہ دنیا میں ایک سو ترانوے ممالک ہیں ۔کل آبادی سوا چھ ارب کے قریب ہے۔دنیا کی صرف پانچ ممالک ساری دنیا کی معیشت چلارہے ہیں۔یعنی امریکہ، برطانیہ،فرانس، جرمنی اور جاپان باقی ایک سو اٹھاسی ممالک ان پانچ کے باج گزار ہیںان پانچ ملکوں کی آبادی ساری دنیا کا نو فیصد ہے۔ساری دنیا کی آدھی مصنوعات ان پانچ ممالک میں پیدا ہوتی ہیں۔جدید ترین ٹیکنالوجی بھی یہ پانچ پیدا کرتے ہیں۔گزشتہ صدی میں ان پانچ ممالک میں معاشیات کے الگ الگ تجربے کیے گئے ہیں۔ جو ناکام ہوئے ۔گویا دنیا میں ہر پانچواں انسان مفلس ہے۔آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک بھی ان پانچ ملکوں کی کرنسی کو بنیاد بنا کر بین الاقوامی معیشت چلاتے ہیں۔دنیا میں سوارب لوگ نہایت غریب ہیں اور روزانہ ایک ڈالر کما کرغربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کرتے ہیں۔مگر لطیفہ یہ ہے کہ غریب ممالک امیر ملکوں کی کفالت کررہے ہیں۔امیر ممالک من مانی شرائط پر غریبوں کو قرضہ دیتے ہیں۔غریب ملکوں سے اجناس اور خام مال سستے داموں درآمد کرتے ہیں اور اپنی مصنوعات مہنگے داموں انھیں برآمد کرتے ہیں۔یہ امیر ممالک اپنی پسند کے ڈکٹیٹر اور حکمران غریب ممالک پر مسلط کرتے ہیں جو قرضے کی رقم خرد برد کر کے دوبارہ امیر ملکوں کے بینکوں میں بھیج دیتے ہیں۔امیر ممالک اس رقم کو دوبارہ قرضے کی صورت میں غریب ملکوں پر مسلط کر دیتے ہیں۔اس طرح غریب ممالک قرضے کی دلدل میں دھنسے رہتے ہیں اور امیر ممالک مزید خوشحالی کی طرف گامزن رہتے ہیں۔ یہ انتہائی گھناؤنا استحصالی نظام ہے اور تم اس کے کرتا دھرتا ہو۔اکیسویں صدی شروع ہوئے تین سال گزر چکے ہیں مگر انسان ابھی تک استحصال کا شکار ہے۔ یہ ترقی کی کون سی قسم ہے کہ ایک طرف انسان خلا میں چہل قدمی کرتا ہے تو دوسری طرف قحط سالی سے مرجاتا ہے۔‘‘

پال زینو کو دیکھتا رہا۔پھر اس نے اپنی نظریں میز پر رکھے ہوئے موبائل فون پر

رکھیں جو کئی گھنٹے پہلے اس نے بند کر دیا تھا کہ بار بار بجنے سے خلل نہ پڑے۔

''تم اپنی ملازمت کو خیر باد کہو۔ آؤ! ہم مل کر عالمی معیشت کا ضابطۂ اخلاق لکھیں۔۔۔ میں نے تمہارا بہت وقت لیا ہے۔ اس وقت کی لاگت میں کیسے ادا کروں۔ یہ زمانہ قدیم کے دو پتھر تحفے میں قبول کرو۔ یہ پتھر زمین سے نکالنے کے بعد دو ہزار تین سو سال سمندر کی تہہ میں رہے ہیں۔''

زینو نے سونے کے دو پتھر پال کو دیئے جن کے اوپر کی سطح ناہموار تھی اچانک پال کا موبائل فون بج اٹھا۔ پال کو نہایت حیرت ہوئی کہ بند فون کس طرح آن ہو گیا۔ اس نے یہ سوچ کر فون دوبارہ بند کر دیا کہ بیئر پینے کی وجہ سے شائد اسے فون بند کرنا یاد نہ رہا ہو۔ اسے یہ سوچ کر مزید حیرت ہوئی کہ اگر فون بند نہیں تھا تو پھر اسے کوئی فون کیوں نہیں آیا کیونکہ اس کے لیے تو فون کالوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔

دونوں باہر نکلے۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ سمندر کے قریب پال نے زینو سے ہاتھ ملایا اور دائیں جانب پینن سولا ہوٹل کی طرف مڑ گیا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ زینو بائیں طرف مڑا۔ سمندر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس کی نظر روشینوں کی اس جگمگاہٹ پر پڑی جو پانی میں ہل رہی تھیں۔ ہانگ کانگ اور کولون کا درمیانی سمندر مخمل کا سرمئی آنچل محسوس ہوتا تھا جس کے کناروں پر آتشیں جھالر جھلملا رہی تھی۔ وہ شنگریلا ہوٹل میں برٹل، تحسین اور ایوا کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ایوا کی موجودگی اُسے بے موقع لگی۔

''برٹل کو اچانک نیو یارک جانا پڑ گیا۔ وہ پرسوں واپس آئے گا۔'' ایوا نے اسے بتایا کہ زینو نے دیکھا۔ ایوا کی نیم خوابیدہ آنکھوں میں سرخ ڈوروں کے ساتھ نم پر اسراریت چمک رہی ہے۔

''ٹھیک ہے۔'' زینو نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کوئی ضروری کام ہوگا جبھی تو برٹل اچانک چلا گیا۔'' ایوا نے کہا تو اس کے لہجے نے بتایا کہ وہ باتیں کرنا چاہتی ہے۔ اس نے سفید رنگ کی باریک شب خوابی پہن رکھی تھی۔ جو جسم کے کچھ حصوں کو دبیز ہو کر انھیں چھپاتی تھی جبکہ باقی جسم کو زیادہ نمایاں کرتی تھی۔ اس کے بال بیک وقت سنورے اور الجھے ہوئے تھے جن میں تھکاوٹ کی لہریں تھیں۔ ان عورتوں کی طرح جو آدھی رات کے بعد اپنے مردوں کا انتظار کرتی ہیں۔ اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی مہک بتاتی تھی کہ کلون نہایت اثر انگیز ہے۔ ایک ہی کلون دو طرح مہکا دے کے بتاتا تھا کہ اسے دو دفعہ لگایا گیا ہے۔ ایک دفعہ آدھی رات سے پہلے اور جب اس کی خوشبو ماند پڑنے لگی تو دوسری دفعہ آدھی رات کے بعد۔ گردن میں حمائل سونے کی باریک زنجیر تھی جس کی قوس کو سینے کی درمیانی لکیر قطعی کرتی تھی۔ وہ لکیر جو پیرہن کے باریک حصے میں چلتی ہوئی دبیز حصے میں گم ہو جاتی تھی۔ ایوا چلتی ہوئی زینو کی طرف آئی، بند قبا کے کساؤ کے نیچے ڈھلکتے ہوئے دامن نے فانوس کی شکل اختیار کی جس کے اندر چلتی ہوئی ٹانگوں کی گلابی لو جل بجھ رہی تھی۔ وہ زینو کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی پنڈلیوں کے مخروطی ابھاروں پر مسام پھولے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے گرم بستر سے اچانک نکلنے پر سرد ہوا کا جھونکا چھو گیا ہو۔ اس نے بات پھر شروع کی۔ کمرے کی روشنیاں اس کے ہونٹوں پر جھلملائیں تو احساس ہوا کہ گلابی ہونٹوں پر جو لپ اسٹک لگائی ہے وہ ہونٹوں ہی کے رنگ کی ہے۔۔۔

''برٹل بھی من موجی ہے۔ جب دل چاہتا ہے، چلا جاتا ہے، جب دل چاہتا ہے آ جاتا ہے۔'' لفظ برٹل ادا کرتے ہوئے وقت ایوا کے ہونٹوں نے دلربا انداز میں حرکت کی حالانکہ یہ لفظ ایوا دن میں کئی بار بولتی ہے۔ مگر اس میں بے ساختگی ہوا کرتی تھی۔ زبان میں اتنا لوچ نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی گردن میں اتنا خم کہ آنکھیں سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو لچکیلے زاویئے سے دیکھنے لگ جائیں۔

''تحسین سو گیا ہے؟'' زینو نے میز پر اخبار رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بہت دیر پہلے سو گیا تھا۔'' ایوا نے کرسی کی پشت پر ٹیک لگائی تو سرسراہٹ ہوئی۔ زینو نے اخبار کی سرخ پڑھی۔

۔۔۔خلائی شٹل فضا میں پھٹ گئی۔۔۔روشنی کی ایک باریک اور تیز لکیر نیلے آسمان کے بدن میں سوئی کی طرح چبھ گئی۔۔۔اوپر آسمان کا جسم اور نیلا ہو گیا اور نیچے زمین کا بدن اور بے حال۔۔۔وہ بدن جو پہلے ہی عالمی عدم تحفظ کی وجہ سے نڈھال تھا۔

''بہت انتظار کروایا تم نے۔۔۔ساڑھے تین بجے آئے ہو۔'' ایوا کی دھیمی آواز میں شکوے کی سرگوشی تھی۔ زینو نے اخبار میز پر رکھا اور ایوا کو دیکھا۔ ایوا نے دیکھا کہ وہ اسے اس نظر سے نہیں دیکھ رہا تھا جیسے لوگ اس کے حشر انگیز سراپے کو تحسین آمیز بے بسی سے دیکھتے ہیں۔

''تم برٹل کی چیز ہو۔'' زینو نے واشگاف لفظوں میں کہا تو ایوا کے تیوروں سے رعنائی اور دلربائی اس طرح اڑ گئی جیسے دھماکے کی آواز سنتے ہی درخت پر بیٹھے ہوئے پرندوں کی ڈار اڑتی ہے۔ ایوا کے اندر چھپی ہوئی تحفظِ نسواں کی جدید شیرنی پورا جبڑا کھول کر دھاڑی:

''چیز؟؟؟ کیا یہ مجھے برٹل کی چیز سمجھتا ہے۔ اس کی ذاتی ملکیت، اس کا سامان، اس کی زمین، اس کا بینک بیلنس، اس کا جہاز یا یہ اس کا کمپیوٹر سمجھتا ہے مجھے۔۔''

''جیسے برٹل تمہاری چیز ہے۔'' زینو نے ایک جملہ اور کہا۔ اندر کی شیرنی نے جب ایک مرد کو بھی چیز کے لقب سے سرفراز دیکھا تو اس کی انا تسکین کو پہنچی اور وہ غرا کر چپ ہو گئی مگر زینو کے اس غیر متوقع رویے کا ردعمل اتنا شدید تھا کہ ایوا کرسی سے ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھی اور اپنے کمرے میں جانے کے لیے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کے پیرہن کا فانوس تھرتھرا رہا تھا۔ مسام اس کی پنڈلیوں پر ہموار ہو گئے تھے۔ فانوس کے اندر تیزی سے چلتی ہوئی ٹانگوں کا گلابی شعلہ پھڑپھڑا کر آنچ دے رہا تھا۔ اس عمل میں دو

مہکاریں دیتا ہوا کلون دو آتشہ ہو رہا تھا۔

روسی ساخت کا ایک پرانا ہوائی جہاز بیجنگ سے شمالی کوریا کے دارلحکومت پیانگ یانگ کی طرف پرواز میں تھا۔ پرواز کا دورانیہ مختصر تھا۔ جہاز میں کورین بیئر سے مسافروں کی تواضع ہو رہی تھی۔ شمالی کوریا کے بارے میں ایک رنگین اطلاعاتی رسالہ سیٹ کی پشت پر چپکی ہوئی جالی کے اندر سے جھانک رہا تھا۔ یہ شمالی کوریا کو واحد پرواز تھی جو دن میں ایک بار چلتی تھی اور دنیا سے اس ملک کا رابطہ بحال رکھتی تھی۔ جہاز لینڈ ہوا تو زینو نے کھڑکی سے ہوائی اڈے پر لگی ہوئی کم ال سنگ کی تصویر دیکھی۔ اپریل کے مہینے کی خوشگوار ہوا جہاز میں داخل ہوئی تو لوگوں نے اترنا شروع کیا۔

ہوٹل کوریو میں زینو کا کمرہ بک تھا۔ اس بار وہ اکیلا سفر پر نکلا تھا۔ ہوٹل میں جانے سے پہلے اس نے کار میں شہر کا ایک چکر لایا۔ جگہ جگہ برقی بسیں اور ٹرامیں بجلی میسر نہ ہونے کے سبب سڑکوں پر کھڑی ہوئی تھیں۔ ٹریفک سگنل بے جان ہو گئے تھے۔ نیلی وردی میں ملبوس نہایت خوبصورت لڑکیاں نہایت خوش اسلوبی سے ٹریفک کا نظام چلا رہی تھیں۔ گوچے ٹاور کے قریب زینو کار سے اترا اور چلتا ہوا اس مخروطی مینار کے پاس آیا۔ وہ اس ستر منزلہ مینار کو کچھ دیر تک دیکھتا رہا جس کے سر پر ایک بڑی مشعل بنی ہوئی تھی۔ مینار کے ساتھ خوبصورت مجسمے تھے۔ تین مجسمے بہت نمایاں جن کا چمکیلا رنگ انھیں پیتل کے مجسمے ہونے کا گمان دیتا تھا۔ سب سے آگے ایک مرد کا مجسمہ تھا جس کے بلند ہاتھ میں کلہاڑا تھا۔ اس مرد کے پیچھے ایک اور مرد اور ایک عورت تھی۔ مرد کے ہاتھ میں موقلم اور عورت کے ہاتھ میں درانتی تھی۔ تینوں کے ہاتھ ہوا میں بلند تھے کہ کلہاڑا، موقلم اور درانتی ایک جگہ پر تھے۔ ہر ایک مجسمے نے دوسرے ہاتھ میں کتاب تھام رکھی تھی۔ مزدور کسان اور دانشور کے اس اتحاد کو زینو دیکھتا رہا۔ چونکہ اپریل کم ال سنگ کی سالگرہ کا مہینہ تھا اس لیے

خوب چہل پہل تھی۔منگولیا کا ایک رنگین طائفہ ساز بجا رہا تھا۔زینو نے ایک رنگین گلدستہ خریدا، جس کے پھول گیلے تھے اور پانی کے قطرے ان پر اوس کی طرح چمکتے تھے۔اس نے پھول بیچنے والے سے ان پھولوں کے نام پوچھے تو اس نے بتایا کہ ان کے نام کم سنگ ایلیا اور کم جانگ ایلیا ہیں۔زینو دوبارہ کار میں سوار ہوکر اولمپک سٹی میں گھومتا رہا۔وہاں اس نے فٹ بال سٹیڈیم میں بیٹھ کر اپنا بیگ کھولا اور کھانا کھایا۔

پریذیڈنسی میں بہت چہل پہل تھی۔یہاں کم اِل سنگ کی حنوط شدہ لاش رکھی تھی جسے سیاح دیکھنے کے لیے آئے تھے۔شیشے کے تابوت میں کم اِل سنگ سرمئی سوٹ پہنے ہوئے دراز تھے۔حسنِ حنوط کاری تھا کہ سر کے بال یوں سنورے ہوئے تھے جیسے ابھی ابھی کنگھی کی گئی ہو۔گہرے عنابی رنگ کی ٹائی کی گرہ بہت سلیقے سے لگائی گئی تھی۔زینو وہاں کچھ دیر کھڑا رہا اور پھر ایک شخص جب اس کے قریب سے گزرنے لگا تو زینو نے کہا:

''کم اِل سنگ کی ٹائی خوبصورت ہے۔عنابی رنگ میں گلابی جھلک پڑتی ہے۔''

اس شخص نے رسمی مسکراہٹ سے بات کا جواب دیا اور جلدی سے باہر جانے لگا۔زینو اس کے پیچھے پیچھے باہر نکلا۔

''چِن۔کہاں بیٹھا جائے؟'' زینو نے آواز دی تو وہ شخص مڑا۔

کار میں زینو اور چِن رواں تھے۔رات ہوچکی تھی۔شہر میں اکثر مقامات پر اندھیرا تھا۔چوراہوں پر کھڑی لڑکیوں کی نیلی وریاں سیاہ ہوچکی تھیں۔ان کے ہاتھ میں رنگین ٹارچیں تھیں جن سے ٹریفک کنٹرول ہو رہی تھی۔جوچے ٹاور کی سرخ مشعل روشن تھی جس کی روشنی سے اردگرد کی عمارتیں رنگین ہو رہی تھیں۔کار چِن کے گھر کے باہر رکی۔پرانی طرز کا چھوٹا سا گھر تھا۔جس کی دیواروں کا پلستر ادھڑا ہوا تھا۔جب چِن نے دروازہ کھولا تو کھولت بھری چوب نے آہ بھری۔کمرے میں تیل بھرا لیمپ روشن تھا۔جو ایک طاق میں دھرا تھا۔طاق کے اوپر کارل مارکس کی ایک بڑی بلیک اینڈ وائٹ تصویر دبیز چوبی فریم

میں کسی ہوئی تھی۔ایک میز کے گرد تین کرسیاں تھیں۔دو پرانی طرز کے پلنگ تھے۔دیوار کے ساتھ والے پلنگ پر چن کا نہایت عمر رسیدہ دادا،کم ،لحاف کے اندر آنکھیں میچے نیم دراز تھا جس کے چہرے پر لیمپ کی روشنی اپنی پیلاہٹ بکھیر رہی تھی۔زینو کرسی پر بیٹھا تو اس کے سامنے چن نے کرسی سنبھالی۔

''تم کیا کرتے ہو؟'' زینو نے بات کا آغاز کی۔

''میں کمیونزم کرتا ہوں'' جواب آیا۔

''کمیونزم کیا ہے؟'' زینو نے پوچھا

چن بازوؤں کا تکیہ بنا کر کرسی کی پشت پر نیم دراز ہوا اور بولا:

''کمیونزم ضابطۂ حیات ہے۔یہ وہ نظریہ ہے جو نجی ملکیت کی لعنت پر خطِ تنسیخ کھینچتا ہے۔یہ مارکسی سوشلزم اور لینن ازم کی بنیاد انقلابی ہے۔پرولتاری نظام ہے،جس میں تمام ذرائع پیداوار مزدوروں کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں۔جنھیں ایک ہمہ گیر مطلق العنان پارٹی برابری کے اصولوں پر شہریوں میں تقسیم کرتی ہے یوں کہ ہر شہری کو اس کی ضرورت کے مطابق مجموعی قومی پیداوار کا حصہ دیا جاتا ہے۔کمیونزم مارکسی نظریے کا وہ آخری درجہ ہے جہاں ریاست کا تصور ختم ہو جاتا ہے اور غیر طبقاتی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔جس میں تمام وسائل اور پیداوار کے مالک اس کو پیدا کرنے والے مزدور ہوتے ہیں۔ مارکسی نظریہ دراصل ہیگل کے جدلیاتی نظام کی الٹ مگر حقیقت پسندانہ اور عملی تصویر ہے۔ہیگل کے مطابق ہر چیز مسلسل تبدیلی کے عمل سے گزر رہی ہے۔کیونکہ ہر چیز کے مخالف ایک دوسری چیز عمل پیرا ہے۔اسی تصادم سے ایک تیسری اور نئی چیز عمل میں آتی ہے اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔مارکس کی مادی جدلیات کے مطابق تبدیلی ہر چیز کی جبلت میں ہوتی ہے۔تبدیلی کے لیے جدلیاتی اصولوں کی ضرورت نہیں بلکہ عملی دانش اور آگہی کی ضرورت ہے جن سے جدلیاتی حقائق خود بخود سامنے آتے ہیں۔تاریخ گواہ ہے کہ سرمایہ

داری نظام ایک استحصالی دیمک ہے جو معیشت کو چاٹ کر کھوکھلا کر رہی ہے۔ سرمایہ داری نظام بورژوائی طبقے کی پرورش کرتا ہے اور پرولتاریوں کی رگوں سے خون اور پسینہ نچوڑ کر قدرِ زائد پیدا کرتا ہے۔ یہ قدرِ زائد مزدوروں کی صرف شدہ قوت کی وہ مالیت ہے جو ان کی اجرتوں سے زائد ہوتی ہے اور جسے مل مالک اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ قدرِ زائد کے بل بوتے پر بورژائی طبقے کی عیاشی اور مزدور کا استحصال ہی وہ عوامل تھے جنھوں نے کارل مارکس سے کمیونزم کے سنہری اصول لکھوائے۔ ۔آپ کورین بیئر پیئں گے؟''

''نہیں میرے پاس سرخ وائن ہے۔'' زینو نے سرخ وائن کی بوتل اپنے بیگ سے نکالی۔ اوپنر سے کارک کھول کر بوتل میز پر رکھی۔ کمرے کی فضا وائن کی کھٹی میٹھی مہک میں سانس لینے لگی۔ چن نے دو گلاس لا کر رکھے۔ زینو نے آدھے آدھے گلاس بھر کر میز پر جمائے تو لیمپ کی روشنی عنابی رنگ کے اوپر تیرنے لگی۔ ہلتے ہوئے سیال کا عکس کارل مارکس کی تصویر پر پڑا تو تصویر کی داڑھی کا گھنگھریالا پن اور واضح ہو گیا۔ اتنے میں چن کے دادا نے دوائی مانگی۔ چن ایک الماری سے دوائی نکال کر دادا کے پاس گیا اور بولا:

''میرے دادا ایک سو سات سال کے ہیں۔ لینن ان کا دوست تھا۔ یہ بہت عرصہ روس میں رہے ہیں اور مارکسی لینن ازم کے عالموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ کافی عرصے سے بیمار ہیں۔ مجھے انھیں اٹھا کر دوائی پلانے اور دوبارہ اطمینان سے لٹانے میں چند منٹ لگیں گے۔''

زینو اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ایک سیلن زدہ طاق میں کتابیں پڑی تھیں۔ اس نے ایک پرانی کتاب نکالی جو کارل مارکس کی داس کیپٹل کا پہلا حصہ تھا۔ وہ لیمپ کے قریب آیا۔ کتاب جرمن زبان میں لکھی تھی۔ زینو نے سیاہی مائل چرمی جلد کے اوپر ہاتھ پھیرا تو ادھڑی ہوئی کھال کے نرم ریشے رگڑ دینے لگے۔ جلد کی دونوں تہوں کے اندر صفحوں کی ضخامت پر دیمک کی کارفرمائی تھی اور چند چھوٹے بڑے گڑھے بتاتے تھے کہ کتاب کھولنے

پر صفحوں کی رنگت خاکی ہوگی۔اس نے کتاب کھولی تو ایک بسکٹی مہک پھیلی۔اب کمرے کی ہواوائیں اور بسکٹ کی مہک سے ضیافت کررہی تھی۔زینو نے کتاب کا پہلا باب پڑھنا شروع کیا۔جس کا عنوان ''اجناس۔۔۔قدرِاستعمال اور قدرِاصل'' تھا۔

''وہ معاشرے جہاں سرمایہ داری نظام پیداوار رائج ہے۔اجناس کی بے پناہ بہتات کا شکار ہوتے ہیں چنانچہ ہماری تحقیق کا آغاز اجناس کے تجزیے سے ہوگا۔جنس وہ چیز ہے جو ہمارے وجود سے باہر اپنا وجود رکھتی ہے اور جو اپنی خصوصیات کی بنا پر انسانی خواہشات کو مطمئن کرتی ہے۔یہ خواہشات انسانی جسم کی ضرورت بھی ہوسکتی ہے اور سراب خیال بھی مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ خواہشات کی قسم کون سی ہے اور نہ ہی اس مقام پر ہم یہ بحث کرنا چاہتے ہیں کہ اجناس کس طرح انسانی خواہشات کی تکمیل کرتی ہے۔اجناس مختلف طرح کی ہوتی ہے جیسے لوہا، کاغذ وغیرہ۔اجناس کے مختلف استعمالات تاریخ دریافت کرتی ہیں۔ہر جنس، خواہ وہ لوہا ہو، مکئی ہو یا ہیرا ہو ایک مادی وجود رکھتی ہے۔اور استعمال ہوتی ہے مگر ہر جنس اس محنت، مشقت یا مزدوری سے ماورا ہوتی ہے جس کے باعث یہ کار آمد بنائی جاتی ہے۔اس لیے اجناس کے دو پہلو ہیں۔ایک ان کی قدر اصل اور دوسری ان کی قدر استعمال۔قدر استعمال کا اندازہ اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب وہ جنس استعمال میں لائی جائے۔۔۔ایک جنس کے عوض دوسری جنس کا تبادلہ ہوتا ہے اگر ہم قدر تبادلہ میں سے قدر استعمال منفی کریں تو جنس کی قدر اصل سامنے آتی ہے، جس طرح مستطیلوں کی پیمائش کرنے کے لیے اسے تکونوں میں بانٹ دیا جاتا ہے لیکن تکون۔۔۔''

چن واپس آ کر کرسی پر بیٹھا تو زینو نے کتاب بند کر کے طاق میں رکھی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔دونوں نے گلاس اٹھا کر بلند کیے:

''کارل مارکس کے نام۔'' زینو نے گلاس کے پس منظر میں تصویر دیکھی جس کی داڑھی پھر گہری ہوگئی تھی۔

''کارل مارکس کے نام اور کم اِل سنگ کے فلسفہ جوچے کے نام۔''چن نے پرولتاریہ جام تجویز کیا۔

''سوشلزم کیا ہے؟''زینو نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''مارکس کے مطابق سوشلزم دراصل کمیونزم تک پہنچنے کا ایک درمیانی مرحلہ ہے۔ مارکسزم میں پیدوار مزدوروں میں ان کی ضرورت کے مطابق تقسیم ہوتی ہے جبکہ سوشلزم میں ضرورت کی بجائے ان کی کارکردگی کی بنا پر۔''چن بولا

''تو گویا سرمایہ داری نظام بیئر ہے۔سوشلزم وائن ہے اور کمیونزم وسکی یا رم ہے۔''

زینو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

چن ہنسا اور بولا''نہیں۔سرمایہ داری نظام پانی ہے۔''

''کیا ملوکی، سامراجی سرمایہ کارانہ نظام سے جست لگا کر، تمام درمیانی مراحل کو نظرانداز کرتے ہوئے پرولتاری انقلاب کے نعرے پر کمیونسٹ پارٹی کا برسراقتدار آکر مطلق العنان حکومت قائم کرنا ایک مثبت عمل تھا؟ کیا یہ تجربہ ایک ایسے ملک پر کرنا جائز تھا، جو رقبے کے لحاظ سے اتنا بڑا ہو کہ سب سے بڑا ابراعظم بھی اس کی جسامت تلے دب جائے؟

کیا روس ان تمام مفروضوں پر پورا اترتا تھا جو کسی ملک کو کمیونسٹ ہونے کے لیے درکار ہوتے ہیں؟۔۔۔کیا یہ سوچا گیا تھا کہ آزاد سرمایہ کاری اور نجی ملکیت کے خاتمے کے بعد ایسا نظام وضع کر لیا جائے گا جن سے پیداوار کی لاگت کا تخمینہ لگایا جاسکے اور پیداوار کو بین الاقوامی تجارت کے لیے بطریق احسن استعمال کیا جاسکے؟۔۔۔کیا اس خطرے کو مدنظر رکھا گیا تھا کہ سرکاری نااہلی کی وجہ سے غیر طبقاتی معاشرے کے قیام کا جنون کافور ہوسکتا ہے اور اس کی جگہ سرکاری دہشت گردی لے سکتی ہے جو ریاستی سرمایہ کاری نظام کی شکل میں جگ ہنسائی کا باعث بنے گی؟۔۔۔''زینو نے پوچھا۔چن خاموش رہا مگر لحاف میں سے

کھانسی کی آواز آئی ۔زینو نے دیکھا کہ کم آہستہ آہستہ تکیے کے سہارے اٹھ کر نیم دراز ہو چکا ہے ۔کم نے آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔ مخاطب زینو تھا۔

ہاں ۔۔۔ ہر چیز کا اندازہ کیا گیا تھا۔ترازو میں تول تول کر ہر چیز رکھی گئی تھی ۔تم کیا سمجھتے ہو کہ روسی انقلاب چند سر پھرے ذہنوں کے جنونی ابال کا نام ہے؟ تم کیا سمجھتے ہو کہ مارکسی فلسفہ صرف لفظوں اور ہندستوں کا تانا بانا ہے ۔جب پتھر پھاڑ کر روسی کمیونیزم کی کونپل پھوٹی ،اس وقت بین الاقوامی سرمایہ داری نظام دہشت کے اوپر معاشی ابتری کا سورج برس رہا تھا اور عالمی سیاست کے پاگل بھیڑیئے بے ہنگم دوڑتے ہوئے نحوست کی دھول اڑا رہے تھے ۔تب یہ کونپل پھوٹی تھی اور چند سالوں میں تناور درخت بنی تھی ۔

''ہاں ۔۔۔یہ سوچا گیا تھا فری مارکیٹ کی عدم موجودگی میں پیداوار اور مصنوعات کی لاگت کا اندازہ کیسے لگایا جائے گا۔صرف روس ہی واحد کمیونسٹ ملک نہیں تھا۔آدھا یورپ بھی اس جیسا تھا۔شمالی کوریا اور کیوبا بھی اس جیسا ہی تھا۔اگر ناعاقبت اندیش سرمایہ کار دنیا اپنی مصنوعات کا اندازہ لگا سکتی ہے تو کمیونسٹ بلاک لاگت اور قیمتوں کا تعین کیوں نہیں کرسکتا ؟ مارکس کی داس کیپٹل اس سلسلے میں رہنما اصول مہیا کرتی ہے۔ طویل بحث میں جانے کے بجائے بہتر یہی ہوگا کہ تم کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ مصنوعات کے اعداد وشمار پر نظر ڈالو اور کسی بھی سال کی قیمتوں کا موازنہ کرو تمھیں کمیونسٹ بلاک کے معاشی استحکام کا اندازہ خود بخود ہو جائے گا۔''

زینو نے کہا:

''سرمایہ کاری نظام کی اپنی کمزوریاں ہیں ۔کمیونزم کے اپنے مسائل تھے۔ نظریاتی طور پر دونوں نظام خوب ہیں مگر عملی طور پر دونوں بھیانک ثابت ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ کیا لینن کے بعد روس سیاسی جبر واستبداد کا شکار نہیں ہوا؟ کیا مزدور کا استحصال نہیں ہوا؟ کیا ٹروٹسکی کا نظریہ درست نہیں تھا کہ ایک کمیونسٹ ملک علیحدگی میں رہ کر ترقی کی

بلندیوں پر نہیں پہنچ سکتا ؟اس لیے ضروری ہے کہ بین الاقوامی سوشلسٹ انقلاب برپا کیا جائے۔کیا ٹروٹسکی۔۔۔‘‘

’’مجھے ٹروٹسکی سے نفرت ہے۔سٹالن نے اسے میکسیکو میں جلاوطن کر کے صحیح قدم اٹھایا تھا اور پھر اسے قتل کروا کے ایک اور صحیح فیصلہ کیا تھا۔ایک کمیونسٹ ملک میں ٹروٹسکی جیسے باغی اور غیر ملکی ایجنٹ کو برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا۔وہ باغی تھا کیونکہ وہ کمیونسٹ پارٹی کے نصب العین سے انحراف کرتا تھا!‘‘ ِکم نے جواب دیا۔آہستہ آہستہ اس کے لہجے میں روانی آرہی تھی۔زینو کرسی سے اٹھا اور ِکم کے ساتھ والے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولا:

’’تم اگر لینن اور سٹالن کے ذاتی دوست نہ ہوتے تو بھی یوں ہی کہتے ؟ مجھے مارکس کے شاندار فلسفے سے اختلاف نہیں ہے۔مجھے اس کے اطلاق سے اختلاف ہے۔افلاطون ہو یا ارسطو ایڈم سمتھ ہو یا کارل مارکس۔دانشور رہوتا ہے۔جگر کے خون کا فلسفہ لکھتا ہے جس کے لفظوں میں صدیوں کی سچائیاں بولتی ہیں۔چلو فرض کر لیتے ہیں کہ سٹالن درست تھا اور ٹروٹسکی غلط۔کیا میں تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ مادی جدلیات اور پرولتاری انقلاب پر مبنی اس عظیم الشان نظریے کو ناکامی کا سامنا کیوں کرنا پڑا۔روس میں بے شمار لوگ بھوک، گولی اور گمنامی کے ہاتھوں کیوں مارے گئے۔جوچے کا فلسفہ شمالی کوریا کا فلسفہ خودی ہے جو عزت نفس،خود انحصاری اور ذاتی دفاع کا فلسفہ ہے۔کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس فلسفے کا اطلاق عملی طور پر کتنا ہے۔اس ملک میں لاکھوں لوگ قحط سالی کا شکار کیوں ہوئے۔تمہارا بیٹا اور بہو یعنی چن کے ماں اور باپ جنوبی کوریا میں کیوں رہتے ہیں۔کیونکہ وہ بورژائی ہیں اور تم رولتاریہ انقلابی۔تمہارے بیٹے کے خلیوں میں تمہارے کروموسوم حرکت کرتے ہیں۔کیا تمہارے کروموسوم بدل گئے ہیں اور ان پر ایڈم سمتھ کی مہر ہے؟اب جنوبی کوریا میں تمہارا بیٹا اپنوں کی یاد میں روتا ہے تو اس کی پھولی ہوئی آنکھوں میں سرخ رنگ کے ڈورے بنتے ہیں۔کسی ڈورے کی شکل درانتی جیسی ہوتی ہے تو کسی کی کلہاڑے جیسی۔اشک باری

کے اس کمیونزم کی تمہاری کتابوں میں کیا تشریح ہے؟

جس طرح ماضی میں کمیونزم کی توہین کی گئی اس طرح آج کل سرمایہ داری نظام کے بخیے ادھیڑے جا رہے ہیں۔ پرولتاری انقلاب اور غیر طبقاتی معاشرے کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ پیداوار کی بے پناہ بہتات ہو اور کمیونسٹ پارٹی کے سربراہی فرشتوں کے ہاتھ میں ہو۔ سرمایہ کاری نظام چلانے کے لیے ضروری ہے کہ منافع حاصل کرنے کے جنون میں زمین کو اندھا دھند خرچ کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ دونوں نظام اچھے ہیں مگر دونوں کو چلانے کے لیے ظرف چاہیے۔''

زینو نے کم کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو پونچھے جو اس کے پردیسی بیٹے کی یاد میں بہہ رہے تھے۔ زینو دوبارہ کرسی پر آ کر بیٹھ گیا اور بولا:

''کیوں نہ ہم مل کر دوبارہ کمیونسٹ مینی فسٹو لکھیں اور اس میں اخلاقیات کے اصولوں کو شامل کریں۔ ہم اس میں طب کے اصولوں کو شامل کریں جس کے مطابق بیماری کی جڑ پر غور کرنا چاہیے محض اس کی علامتوں پر نہیں، تیسری دنیا کے جسم سے بہتا ہوا خون ایک علامت ہے بذات خود بیماری نہیں ہے۔ کمیونزم کی ناکامی ایک علامت ہے۔ اس کی بیماری تلاش کرنا ضروری ہے۔''

سہ پہر کا وقت تھا۔ کچھ دیر پہلے برسی ہوئی بارش کی مہک سمندر کی نمی سے مل کر بوجھل ہوتی تھی جسے بادلوں سے جھانکتا ہوا سورج نرم کرتا تھا۔

پینن سولا ہوٹل سے پیدل چلتے ہوئے زینو اور پال ساحل سمندر پر آئے۔ کولون اور ہانگ کانگ کے درمیان مختصر سا سمندر بہت بارونق تھا۔ انواع و اقسام کی چھوٹی کشتیاں اور بحری جہاز سمندر کے بے چین پانی میں رواں دواں تھے۔ پرانی طرز کی ایک بادبانی کشتی بھی پانی کی لہروں پر اچھل رہی تھی جسے زینو نے مسکرا کر دیکھا۔

ساحل سمندر پر ایک آہنی جنگلا تھا جو سیاحوں کی حفاظت کے لیے بنایا گیا تھا۔ جگہ جگہ استراحت کرنے کے لیے بینچ موجود تھے۔ ذرا ذرا فاصلے پر اشیائے خورد و نوش کی چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں ۔ ہر چھوٹی دکان میں ایک بڑا فریز ر تھا جس کے شیشے سے بنے ہوئے دروازے کے اندر جمی ہوئی بیئر کی بوتلیں چہل قدمی کرنے والوں کو دعوت ناؤ نوش دیتی تھیں ۔لوگ جتھوں کی صورت میں پیدل چلتے ہوئے موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دنیا بھر سے آئے ہوئے رومانوی جوڑے جب بوس و کنار کرتے تو ان کی ادھ کھلی مخمور آنکھوں میں نمیدہ ہوا کی تیز سلائی پھر کر بوسوں کو مختصر کرتی تھی۔ فالن ڈافا۔۔فرقے سے تعلق رکھنے والا ایک گروہ زمین پر بیٹھ کر مراقبہ کرنے میں مصروف تھا۔اس گروہ میں زیادہ تر چینی نژاد اور کچھ دوسرے ممالک کے لوگ تھے۔

پال سمندر کی طرف تھا اور زینو اس کے برابر۔ پال نے بیئر کا کین کھولا اور ہنس کر بولا:

''یہ بڑا دلچسپ قصہ ہے۔ جب گولڈ سٹینڈرڈ ختم ہوا تو سرکاری بینکوں مثلاً بینک آف انگلینڈ میں پڑا ہوا کئی ہزار ٹن سونا بے کار ہو گیا۔سرکاری بینکوں کے لیے یہ بانجھ سونا مہنگی ذمہ داری تھی۔ کیونکہ سونا سٹور کرنے اور انشورنس کی ادائیگی کے باعث نقصان ہوتا تھا۔ چنانچہ سرکاری بینکوں نے یہ سونا ایک فیصد سود پر کمرشل بینکوں کو مستعار دے دیا۔اب ظاہر ہے کہ کمرشل بینک اس سونے کو اپنے پاس کیسے پڑا رہنے دیتے کیونکہ ایسا کرنے پر انھیں سٹور کرنے اور انشورنس کی ادائیگی کرنا پڑتی تھی یعنی ایک فیصد سود الگ اور مزید ایک فیصد انشورنس اور سٹوریج کی لاگت الگ ۔ گویا بیٹھے بٹھائے دو فیصد کا نقصان۔ چنانچہ کمرشل بینکوں نے یہ سونا چھ فیصد سود پر کھلی مارکیٹ میں زرگروں کے ہاتھ قرضے پر دے دیا۔زرگروں نے زیورات بنائے اور دنیا بھر کی عورتوں نے نت نئے زیورات زیب تن کیے۔اب کمرشل بینک گھبرائے کیونکہ سونا تو دراصل سرکاری بینکوں کی

امانت تھا اور انھیں کسی بھی وقت واپس کیا جاتا تھا۔ چنانچہ کمرشل بینکوں نے سٹہ بازی شروع کی۔ جب مارکیٹ میں سونا سستا ہوتا تو وہ اس ارادے پر خرید لیتے کہ آئندہ مہنگے داموں فروخت کریں گے۔ مارکیٹ کے سٹہ باز سونا اس زعم پر بیچ دیتے کہ جب سونے کی قیمت مزید گرے گی تو وہ اسے دوبارہ خرید لیں گے۔ جب سونا مارکیٹ میں زیادہ ہوتا تو عورتیں زیادہ زیورات خرید لیتیں مگر جب سونا مہنگا ہوتا تو سونے کی دیوانی عورتیں سٹہ بازی کے اصول کے برخلاف یہ زیورات نہ بیچتیں کیونکہ عورتیں اس امر سے بے خبر تھیں کہ بازار میں سٹہ ہورہا ہے۔ نتیجتاً دنیا بھر کی عورتوں کے پاس سونا زیادہ ہوجاتا جبکہ سونے کے پیدا کاروں، ریفائنری کے مالکوں، مارکیٹ میں سٹہ بازوں اور کمرشل بینکوں کے پاس سونے کی مقدار کم ہوجاتی۔ جب بھی کمرشل بینکوں کے پاس سونا کم ہوتا تو ان کے طوطے اڑ جاتے کیونکہ سونا تو حکومت سے مستعار لیا گیا تھا اور پھر جب سرکار نے سونا واپس مانگا تو کمرشل بینکوں کے لاکر ویران تھے۔ سونے کی زیادہ مقدار عورتوں کی گردنوں اور کانوں میں لٹک رہی تھی۔''

''لوگ سونے کے دیوانے ہیں'' زینو نے کہا۔

''ہاں! اب تو لوگ جسم کے مختلف حصوں میں سونا پہنتے ہیں۔ بعض منچلے مرد عضو تناسل میں چھید کر کے سونے کی چھوٹی بالی پہنتے ہیں۔ عورتیں بظر کے قریب اور سر پستان کو بندوں سے آراستہ کرتی ہیں۔ کئی ناف کی جلد میں سوراخ کر کے بالی سجاتی ہیں۔'' پال نے کہا۔

قریب سے ایک سیاہ فام جوڑا گزرا۔ عورت کا پیٹ ننگا تھا اور اس کی ناف میں سونے کی بالی لٹک رہی تھی۔

''تم یوں کیوں نہیں کرتے کہ سونے کے ذخیرے سے چند ہزار ٹن خرچ کر کے پوری تیسری دنیا کے قرضے چکا دو تاکہ ایک مثبت تبدیلی رونما ہوسکے۔ تمھیں مل کر تو یہ

احساس ہوتا ہے کہ اگر تم چاہو تو ساری دنیا خرید لو۔۔۔کیا تم ساری دنیا خریدنا پسند کرو گے؟'' پال نے ہنستے ہوئے کہا اور بیئر کا رکین قریبی ڈرم میں ڈالنے کے لیے رکا۔ جونہی پال اور زینو میں ایک قدم کا فاصلہ ہوا تو فائر کی دل ہلا دینے والی آواز نے ایک لمحے کے لیے ساحلی ماحول پر سناٹا طاری کر دیا۔ پال آہنی جنگلے سے ٹکرایا اور گھوم کر زمین پر گر گیا۔ نشانہ باز کی مشاقی کی انتہا تھی کہ گولی پال کی بائیں کنپٹی سے داخل ہوئی اور دائیں سے باہر نکل گئی ۔لوگ افراتفری میں ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ مراقبہ کرنے والے گروہ کی بند آنکھیں دہشت سے ابل پڑیں۔ ریاضت کا خمار کافور کی طرح اڑ گیا اور جان بچانے کی جبلی خواہش میں گروہ کے لوگوں نے ایک دوسرے کو روند ڈالا۔آن کی آن میں ساحل سمندر ویران ہو گیا۔ بس زمین پر پال تھا اور اس کے قریب کھڑا ہوا زینو۔ زینو نے دیکھا کہ پال ساحل کے طویل وعریض بستر پر لیٹا ہوا ہے اور اس کے سر کے نیچے خون کا سرخ تکیہ ہے جسے ساحل کی ہوا کا دباؤ وسیع کر رہا ہے۔ کچھ ہی دیر میں پولیس کا ایک چاک و چوبند دستہ دوڑتا ہوا آیا اور واردات کے اردگرد کا وسیع علاقہ اپنے احاطے میں لے لیا۔ پولیس آفیسر نے زینو کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا اور ٹھنڈے لہجے میں کہا:

''آپ جا سکتے ہیں!''

زینو مسلسل بائیں جانب ایک بلند عمارت کی اس کھڑکی کو دیکھ رہا تھا جہاں سے فائر کیا گیا تھا وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا شنگر یلا ہوٹل میں داخل ہوا۔ اپنے کمرے میں کچھ دیر ٹہلتا رہا اور پھر کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔

———————

سورج سہ پہر میں تھا۔ زینو سڈنی شہر میں تھا۔

کئی ملکوں سے ہوتا ہوا زینو بالا آخر آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں اترا تھا۔ مئی کا مہینہ اختتام میں تھا۔ فضا میں خوشگوار خنکی تھی ۔ دنیا کے بہت سے گنجان آباد شہروں کے برعکس سڈنی

کے اوپر آسمان قدرے صاف اور نیلا تھا۔

سڈنی ہاربر کے آہنی پل کے قریب ٹہلتا ہوا زینو ساحل سمندر کے جانب نیچے اُترا۔لوگوں کا ایک اژدہام تھا جو مختلف بسوں اور کشتیوں کے ذریعے مختلف تفریحی مقامات کی جانب رواں دواں تھا۔ایک طویل وعریض شفاف بس جو نیلے پہاڑوں کی طرف جانے والی تھی۔ سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔زینو نے اس بس کی چمکیلی آہنی دیوار میں ایک ریستوران کا عکس دیکھا جو زینو کی پشت پر تھا۔وہ ایک جھٹکے سے مڑا اور ریستوران کے اندر داخل ہوا۔ ہر طرف تازہ پکے ہوئے کھانوں کی اشتہا آور مہک پھیلی ہوئی تھی۔مصالحوں کی اس مہک میں سگریٹ کے دھویں اور دھیمی موسیقی کی آمیزش تھی۔پلیٹوں کے روغنی پیندوں پر کٹکٹاتے ہوئے کانٹے، چمچے اور چھریاں گفتگو کی سرگوشیوں میں چھید کرتے تھے۔ایک اکیلا شخص میز پر رکھے تلے ہوئے پران کھانے میں محو تھا۔مکمل سراپا ہونے کے باوجود شخص بے چہرہ لگتا تھا کیونکہ اس کا چمکتا ہوا چہرہ دھات کا بنا ہوا محسوس ہوتا تھا۔یوں لگتا تھا جیسے اس نے اپنے چہرے کے اوپر پیتل کا ماسک چڑھا رکھا ہو۔جب وہ پران کو کانٹے میں پرو کر منہ میں رکھتا اور تیزی سے چباتا تو زخم کا مندمل نشان اس کے دائیں رخسار پر یوں ہلتا جیسے پیتل کے ناقص برتن پر بے احتیاط ہتھوڑی کی ضرب کا دھبا دھندلا منظر پیش کرتا ہے۔اس کی غیر شفاف آنکھیں ہوتے ہوئے بھی نہیں تھیں۔ایسا لگتا تھا جیسے اس نے اپنی آنکھوں پر بھی ماسک چڑھا رکھا ہو۔اس کے ہاتھ نہایت مضبوط تھے گویا پتھر سے تراش کر بنائے گئے ہوں۔اس کے چوڑے کاندھوں پر نہایت مضبوط گردن تھی۔جس کے نمایاں پٹھے دورانِ خورونوش نمایاں تر نظر آتے تھے۔

''پران کھاتے ہو۔۔۔لی؟ زینو نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔جب اس شخص نے اپنا اصل سنا تو چونک کر زینو کو دیکھا۔

''گزشتہ دس سال میں کتنے پران کھا چکے ہو؟'' زینو نے پوچھا۔

اس شخص کے منہ میں نوالا اور پھیپھڑوں میں پران جم گیا۔اس سے پیشتر کہ وہ سر سے پاؤں تک جم جاتا، یکا یک اندر کا سناٹا توڑ کر اٹھا اور باہر کی طرف دوڑا۔زینو پیچھے پیچھے باہر نکلا۔سامنے ایک عورت سر سے پاؤں تک جسم کو سنہری رنگ دے کر مجسمے کا روپ دھارے لوگوں کی تفریح میں مصروف تھی۔سڑک پار کر کے وہ شخص کسی نابینا آدمی کی طرح اس جعلی مجسمے سے ٹکرایا۔اتنی شدت سے کہ زندہ عورت کا مجسمہ قریبی کھمبے سے لگا اور خون کی سرخ لکیر سر سے نکل کر سنہری جسم پر بہنے لگی۔

———————

براعظم آسٹریلیا کے درمیان دنیا کی سب سے بڑی چٹان ''اولرو'' زینو کو نقشے پر یوں نظر آتی تھی جیسے کسی نے آسٹریلیا کے گتے پر کیل ٹھونک کر اسے سمندر کی تہہ میں گاڑ دیا ہو۔اندرونِ ملک پرواز کے ذریعے زینو اولرو پہنچا۔اسے یہاں سرخ رنگ کا صحرا بہت پسند آیا جس کے بیچوں بیچ یہ چٹان تھی جو سورج کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ رنگ بدلتی تھی۔جامنی، سرمئی ،نارنجی ،خاکی ،گلابی اور کبھی کھلتا ہوا سرخ رنگ ۔زینو ننگے پاؤں صحرا کی نہایت باریک اور سرخ رنگ کی ریت پر چلتا تو اس کے پاؤں کے تلوے گدگدانے لگتے۔وہ سارا دن ریت پر چلتا رہا اور چٹان کے بدلتے

ہوئے رنگ دیکھتا رہا۔اسے بحیرۂ آژ کا وہ جزیرہ یاد آ گیا جہاں اس نے نوجوانی کے چند سال گزارے تھے۔وہاں بھی جھیل کے اردگرد سرخ رنگ کی ریت تھی جو بہت باریک تھی۔ اسے یاد آیا کہ ایک دن اس کے باپ نے بہت سا سونا اس ریت پر رکھ کر کہا تھا کہ سونے کی پیلاہٹ سرخ ریت پر زیادہ کھلتی ہے۔

غروب آفتاب میں کوئی بیس منٹ باقی تھے۔شفق کے رنگین انعکاس سے چٹان کا رنگ سرخ ہو چکا تھا۔زینو نے ایک قریبی ٹیلے پر چڑھنا شروع کیا۔پیتل کے چہرے والا شخص وہاں تن تنہا کھڑا تھا اس کی پشت زینو کی طرف تھی اور وہ خون رنگ چٹان کا نظارہ

کرنے میں محو تھا۔اس کے ہاتھ میں سرخ وائن کا گلاس تھا۔شیشے کے اندر مئے آتشیں چٹان کے رنگ سے مشابہ تھی۔زینواس کے برابر جا کھڑا ہوااور بولا:

''خون پیتے ہو؟۔۔۔لی!''

لی کے ہاتھ سے ساغر چھوٹ کر ریت ملی سرخ مٹی میں گراتو وائن پیاسی مٹی نے پی لی۔

''پران کھاتے ہواور خون پیتے ہو!''زینو نے کہا۔

لی نے دوڑنے کاارادہ کیا تو اس کا ایک ایک پاؤں دو دو من کا ہو گیااور اس نے محسوس کیا جیسے وہ ٹیلے میں گڑ جائے گا۔

''میں کئی ممالک میں تمہارا تعاقب کررہا تھااور دیکھ رہا تھا کہ ایک قاتل زندگی کیسے بسر کرتا ہے۔بتاؤ پچھلے دس سال میں تم نے کتنے پران کھائے اور کتنا خون پیا؟''

زینو نے پوچھا۔

''میں نے پچانوے لوگ مارے ہیں۔''لی نے بتایا

''کیوں؟''

''کیونکہ یہ میرا پیشہ ہے۔میں دنیا کا بہترین اجرتی قاتل ہوں۔''

''تم نے پال کو کیوں قتل کیا؟''

''کیونکہ اس کا حکم ملا تھا!''

''حکم کس نے دیا تھا؟''

''یہ مجھے معلوم نہیں۔''

''تو گویا ہوائی پیشہ کرتے ہو۔کتنی رقم ملی پال کو مارنے کے لیے؟''

''ایک ملین ڈالر۔''

''اگر میں تمھیں دوملین ڈالر دوں اور یہ کہوں کہ تم اس شخص کا قتل کرو جس کے

کہنے پر تم نے پال کو قتل کیا تھا تو تم کرو گے؟'' زینو نے پوچھا تو وہ خاموش رہا۔

''کرو گے؟''

''مجھے اس شخص کا علم نہیں۔''

میں بتاؤں گا، زینو نے سینے پر دائیں ہاتھ کی پور رکھ کر کہا تو وہ شخص خاموش رہا۔

''تم نے پال کو قتل کیوں کیا؟''

''مجھے وجہ معلوم نہیں۔''

''تمہاری اکلوتی بیٹی ہے لاس اینجلس میں، میں تمھیں دس ملین ڈالر دیتا ہوں۔تم اسے قتل کر دو'' زینو نے پیش کش کی۔

''مگر کیوں؟''

''تم پیشہ ور قاتل ہو۔ ہوائی روزگار ہے تمہارا۔ بغیر وجہ کے قتل کرتے ہو۔ اب وجہ کیوں پوچھتے ہو؟ چلو یہ بتاؤ اگر میں تمھیں پانچ سو ملین ڈالر دوں تو خود کو قتل کرو گے؟'' لی خاموش رہا۔

''تم نے مجھے قتل کیوں نہیں کیا جب میں پال کے ساتھ ساحل سمندر پر گھوم رہا تھا؟'' زینو نے پوچھا۔

''ہم تو تمہاری حفاظت پر معمور ہیں۔ تمھیں کیسے قتل کر سکتے ہیں؟''

''مگر تم میری حفاظت کیسے کر سکتے ہو؟ تم تو مجھ سے کتراتے ہو۔ مجھے دیکھتے ہی دوڑ جاتے ہو!''

''مجھے تم سے خوف آتا ہے کیونکہ تم مجھے میرے اصل نام سے پکارتے ہو۔ میں نے اپنے کمانڈر کو بتا دیا ہے کہ مجھے تمہاری حفاظت کا کام مت سونپا جائے۔ میرے علاوہ پورا گروہ تمہاری حفاظت پر معمور ہے۔ اس گروہ کے ارکان زمین پر بھی ہیں، فضا میں ہیں اور خلا میں بھی۔ یہاں اولرو میں بھی ہیں، جس پرواز میں تم آئے تھے اس میں آئے ہیں۔''

''تم لوگ میری حفاظت کیوں کرتے ہو؟''

''معلوم نہیں۔''

''کس کے کہنے پر کرتے ہو میری حفاظت؟''

''معلوم نہیں۔''

''تم لوگ میری حفاظت اس لیے کرتے ہو کیونکہ میرے پاس سونے اور ہیروں کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اور وہ ذخیرہ صرف میں نکال سکتا ہوں یا میرے دو دوست۔ مجھے یہ بھی علم ہے کہ دنیا میں قیمتی پتھروں کے ذخیرے کہاں کہاں ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کئی پتھر ابھی تک دریافت ہی نہیں ہو سکے جو ہیرے سے کہیں زیادہ بہتر ساخت کے ہیں۔ میں وہ پتھر نکال سکتا ہوں۔ایک دھات ہے جو سونے سے کہیں زیادہ دل کش اور دلربا ہے۔ میں وہ دھات نکال سکتا ہوں۔اس لیے تم میری حفاظت پر معمور ہو۔'' زینو نے بتایا۔

''ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔'' لی نے ہوائی جواب دیا۔

''یہاں اولرو پر کیا کرنے آئے ہو؟''

''یہاں آ کر میں سکون کرتا ہوں، جب میرے اعصاب شل ہو جاتے ہیں تو اس چٹان کو دیکھ کر میرے دماغ کو طمانیت ملتی ہے۔'' لی نے چٹان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''خون کرتے ہو اور خون کو دیکھ کر طمانیت حاصل کرتے ہو۔خون کو خون سے کاٹتے ہو تم۔'' زینو بولا اور لی کو دھکا دے کر سرخ زمین پر گرا یا۔ایک گولی سنسناتی ہوئی اس جگہ سے گزری جہاں ایک لمحے پہلے لی کھڑا تھا۔ لی کا چہرہ سونے کی رنگت جیسا ہو گیا۔

''کوئی مجھے مارنا چاہتا ہے ۔۔۔تم نے میری جان بچائی ہے ۔میری زندگی تمہاری امانت ہے۔'' یہ کہتے ہوئے لی اٹھا،لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے ٹیلے سے نیچے اترا اور اپنی گاڑی کی طرف بھاگا۔ زینو اس طرف چل پڑا جہاں سے گولی آئی تھی۔

زینو کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر وہ عورت ایک ٹیلے کے پیچھے غائب ہوگئی۔

اولرو میں رات تھی۔ رات میں خنکی تھی اور خنکی میں نمی تھی۔ چھوٹے سے ہوٹل میں سیاح اِدھر اُدھر چل پھر رہے تھے۔ کمرہ نمبر بارہ کے سامنے زینو رکا اور صندلی دروازے پر دستک دی۔ دوبارہ دستک دینے پر دروازہ محتاط انداز میں کھلا۔ نیم دروازے سے عورت کا مستعد چہرہ نمودار ہوا۔ آدھے چہرے کو دروازے اور چوکھٹ نے چھپایا ہوا تھا۔ زینو پر نظر پڑتے ہی عورت کا چہرہ ہلدی ہوگیا اور پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر جا گرا۔ مگر زینو کے تیور پگھل گئے جب اس نے دیکھا کہ وہ عورت ایما کا دوسرا روپ تھی۔ وہ ایما جو اسے افلاطون کی اکیڈمی میں ملی تھی۔ جب وہ اکیڈمی کے برآمدے میں چل رہا تھا تو ایک آواز اس کی پشت سے ٹکرائی تھی۔

''زینو۔۔۔''

''میرا نام ایما ہے۔۔۔ ایما زان۔۔ ماہر لسانیات ہوں۔''

زینو اور آدھے چہرہ والی عورت جمی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر عورت نے آہستہ آہستہ دروازہ کھولا۔ زینو کے چہرے پر نظریں جمائے پیچھے ہٹتی گئی۔ زینو دھیرے دھیرے کمرے میں داخل ہوا۔ عقب میں دروازہ بند ہوا۔ اس دوران زینو کو خیال آیا کہ برف میں جمی ہوئی ایما کو برٹل نے نکال کر شاید دوبارہ زندہ کر دیا ہے، مگر اگلے ہی لمحے اس نے اس خیال سے انکار کر دیا کیونکہ ایما قاتل نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ گولی نہیں چلا سکتی تھی۔۔۔ وہ عورت جو ہیرا اور ایفروڈائٹ کے مجسموں کے درمیان کھڑی ہوکر دیوی لگتی تھی گولی کیوں کر چلا سکتی تھی۔

پچھلے قدموں پر چلتے چلتے وہ عورت بیڈ سے ٹکرائی۔ توازن بگڑا اور بستر پر بیٹھ گئی۔ زینو سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھا۔ دونوں کے تارِ نظر ابھی تک الجھے ہوئے تھے۔ زینو کو ایتھنز میں اپنے نانا کا گھر یاد آیا۔ جس کے سٹوڈیو میں شاہکار مجسمے جادوئی خال وخد لیے

دیکھنے والی آنکھوں کو پتھر کیا کرتے تھے۔۔۔اسے وہ رات یادآئی جب وہ اورایما سٹوڈیومیں داخل ہوئے تھے۔رات کو جب بت کدے میں چراغ جلایا گیا تو مجسموں کے سائے نکل کر دیواروں پر لرزنے لگے تھے۔۔۔اس نے ایما کے لوحِ جسم پر لمس کا خط میخی کھینچا تھا اور میسوپوٹیمیا کی قدیم زبان میں کہا تھا:

''تمہاری آنکھیں سرخ ہورہی ہیں۔''

ایمانے قدیم فارسی میں پوچھا''کیا تمھیں آنکھوں کا رنگ نظر آتا ہے؟''

تواس نے سنسکرت میں جواب دیا تھا''ہاں! چراغ کی لو بتاتی ہے۔۔۔!''

زینو مسلسل اس عورت کو دیکھتا رہا۔عورت کے تیور سنبھلنا شروع ہوئے۔چہرے کی وحشت کافور ہوتی رہی اور بالآخراس پر وہ معصومیت لوٹ آئی جو کسی دور میں ایما کے چہرے پر دھوپ کی طرح برستی تھی۔زینو اس کے پاس جا بیٹھا۔اس کے ہونٹوں کو چوما۔دونوں کی آنکھوں سے آنسو چھلکے اور رخسار نم ہوگئے۔زینو نے میسوپوٹیمیا کی قدیم زبان میں کہا:

''تمہاری آنکھیں سرخ ہورہی ہیں۔''

عورت نے انگلش میں پوچھا۔

''کیا تمھیں آنکھوں کا رنگ نظر آتا ہے۔؟''

تو زینو نے فرانسیسی زبان میں جواب دیا تھا''ہاں! چراغ کی لو بتاتی ہے۔۔!''

اس بات پر دونوں ہنسے،کمرے میں کوئی چراغ نہیں تھا۔ٹیبل لیمپ کی لائٹ قالین اور چھت پر روشن دائرہ بنارہی تھی۔عورت نے ٹیبل لیمپ بجھایا اور زینو سے لپٹ گئی۔

''تمہارانام ایما ہے۔'' زینو نے اندھیرے میں اسے بتایا۔

اگلے دن دونوں اولرو کی سرخ ریتلی زمین پر ننگے پاؤں چل رہے تھے۔ایک درخت کے قریب زینو رکا۔تیر کمان اپنے بیگ سے نکالا،تیر کی نوک سونے کی تھی اور اس کی

دم کے گرد سونے کا پترا تھا۔ زینو نے چٹان کی طرف تیر چھوڑا۔ سرسراتی ہوئی کوہی ابابیل درخت سے نکل کر تعاقب میں نکلی۔

زینو نے عورت کے ننگے پاؤں دیکھے۔ بڑھے ہوئے ناخنوں کو بڑے اہتمام سے تراشا اور نوکیلا کیا گیا تھا۔ ہلکے نیلے رنگ کی نیل پالش ان پر چمک رہی تھی۔ ایڑیاں نہایت صاف اور ملائم تھیں۔ چلتے قدموں کے ساتھ خون کی گلابی ان میں دوڑتی اور رکتی تھی۔

''آج کل تمہارے ہاتھ اور پاؤں بہت خوبصورت ہیں، پرانے زمانے میں تمہارا چہرہ زیادہ خوبصورت ہوا کرتا تھا۔ کیا تمہارے چہرے کی کچھ کشش ہاتھ پاؤں میں سرایت کر گئی ہے؟'' زینو نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ایمانے اس کی گلے میں بانہیں ڈال کر پاؤں اٹھائے تو تلوے صحرا کی ریت کی طرح سرخ ہو گئے۔

باب ہفتم

دنیا کے آٹھ مہذب ترین ،ترقی یافتہ ترین اور امیر ترین ممالک کا سربراہی اجلاس لندن میں منعقد ہونے والا تھا۔اسی دوران انکشاف ہوا کہ دہشت گرد تنظیمیں لندن میں سرگرم عمل ہیں اوران کی کاروائیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔برمنگھم میں بھی یہی صورت حال تھی۔شیکسپیئرتھیٹر یکل کمپنی نے رائے دی کہ یہ ہم اجلاس اگرشیکسپیئر کے شہر سٹر یٹفورڈ میں منعقد ہوتو بہتر رہے گا۔موجودہ حالات میں رائل شیکسپیئرتھیئٹر کی سٹیج سربراہی اجلاس کے لیے موزوں ترین جگہ ہے۔سٹر یٹفورڈ پرسکون ،مختصر اورالگ تھلگ شہر ہونے کے سبب حفاظتی اعتبار سے بہترین جگہ ہے۔چنانچہ تجویز مان لی گئی۔

زینولندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ سے سیدھا وارک شائر پہنچا۔اسے وہاں کا مختصر قلعہ اچھا لگا مگر وہاں پولیس،فوج اور پتھرائی ہوئی آنکھوں والے خاص لوگوں کا ہجوم تھا۔

پتھرائی ہوئی نظریں جب قلعے کی پتھریلی دیواروں سے ٹکراتیں تو قلعے کے صحن میں سنسناہٹ پیدا ہوتی اور صحن میں کھلے ہوئے پھول رکی ہوا میں تھرتھرانے لگے۔ماہ جون کی

خوشگوار ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔شام کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔سورج غروب ہوا چاہتا تھا۔زینو نے وارک شائر سے کونٹری جاتے ہوئے سڑک کے کنارے جا بجا مستعد دستے دیکھے جو اسلحہ بردار تھے۔ہیٹن کا قصبہ بھی ان فرائضِ خاص ادا کرتے ہوئے سپاہی نما لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔جب زینو کی گاڑی سٹریٹفورڈ کی سڑک پر رواں ہوئی تو راستہ مکمل طور پر ویران تھا۔جا بجا حفاظتی دستوں کی گاڑیاں لبِ سڑک کھڑی تھیں۔فضا میں کہیں کہیں ہیلی کاپٹر ٹھہرے ہوئے تھے جن کے گڑگڑاتے ہوئے پروں کے دائروں پر شفق کی روئی دھنک دھنک اڑ رہی تھی۔جب گاڑی شیکسپیئر کے شہر میں داخل ہوئی تو سڑک پر لوہے کا بیرئیر راستہ روکے ہوئے تھا۔ایک بندوق بردار دوڑتا ہوا گاڑی کے پاس آیا۔زینو نے شیشہ اتارا۔ سپاہی کچھ دیر زینو کو دیکھتا رہا پھر پیچھے ہٹ گیا۔بیرئیر نے سڑک پر حادہ زاویہ بنا کر راستہ کھولا۔گاڑی شہر میں داخل ہوئی۔آسمان نے شام پہنی ہوئی تھی اور شہر نے سناٹا اوڑھ رکھا تھا۔دریائے ایون کے پانی پر کشتیاں خاموش کھڑی تھیں۔ہر عمارت کے اوپر سر اور سروں پر آہنی ہیلمٹ تھے۔سڑک کے دورویہ کھمبے روشن ہوئے تو زینو نے جواب میں گاڑی کی لائٹیں جلائیں۔

تھیئٹر کے ہال کا وسطی دروازہ کھلا۔زینو خالی کرسیوں کے درمیانی راستے پر چلتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر سٹیج پر پہنچا۔کونے میں رکھی ہوئی چھوٹی کرسی کھینچی۔گول میز کے کنارے پر رکھی نشست سنبھالی۔دایاں ہاتھ گھما کر خالی نشستوں کی طرف اشارہ کیا تو آٹھوں بیٹھ گئے۔سٹیج پر مکمل سناٹا تھا جس کا تماشا ہال کی سینکڑوں خالی کرسیاں کر رہی تھیں۔گول میز پر شفاف وائن گلاس رکھے تھے جن میں سرخ وائن کی سطح پر خاموشی چمک رہی تھی۔جب بھی کسی ساغر کی سطح پر خفیف شکن پڑتی تو خاموشی کی چمک ہاتھ پھیر کر اسے بجھا دیتی۔زینو بولا:

"شیکسپیئر کہتا ہے کہ تمام دنیا ایک سٹیج ہے اور تمام مرد وزن اداکار۔تمام اداکاروں کا سٹیج سے جانے کے لیے ایک راستہ ہے۔اسٹیج پر آنے کے لیے ایک راستہ ہے۔

زندگی کے سٹیج پر ہر شخص مختلف کردار ادا کرتا ہے۔ مہد سے لحد تک۔

شاعری اپنی جگہ، شاعری کی دلکشی اور رعنائی اپنی جگہ، مگر میں نے یہ دیکھا ہے کہ دنیا تھیئٹر کا سٹیڈیم ہے، ہال ہے اور تقریباً تمام مرد و زن تماشا دیکھنے کے لیے ہال میں آتے ہیں۔ ہال سے باہر جانے کے دروازے ہیں۔ ہال میں داخل ہونے کے دروازے ہیں۔ ادا کار ہر دور میں گنے چُنے ہوا کرتے ہیں۔ یہی کوئی آٹھ دس۔ اصل چیز ڈرامے کی ریہرسل ہوتی ہے جس کے لیے ہال کی نشستوں کا پر ہونا ضروری نہیں۔ خالی ہال میں یہ کام بہتر انجام پاتا ہے۔ شیکسپیئر تھیٹریکل سوسائٹی کا یہ قدم نہایت مستحسن ہے کہ انھوں نے دنیا کی اعلیٰ ترین سربراہی کانفرنس کے لیے تھیئٹر کا سٹیج پیش کیا۔ دنیا کی سیاسی تاریخ میں ایسا عملی قدم پہلے کبھی نہیں اٹھایا گیا۔

کیا تم آٹھوں یہ جانتے ہو کہ نظام شمسی میں ایک ایسا سیارہ بھی محو گردش ہے جو مسلسل بیمار ہوتا جا رہا ہے۔ جس کی مٹی کی تپ اور پانی کی بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ جس کے جسم کو ادھیڑا اور جس کے وسائل کو بکھیرا جا رہا ہے۔ جس کی فضا میں سوراخ ہوتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے سورج کی شعاعوں کا قہر براہ راست حملہ آور ہے۔ جب ساٹھ ہزار سال بعد مریخ اس سیارے کے قریب سے گزرے گا تو دیکھے گا کہ اس کی چمک ماند پڑتی جاری ہے۔ یہ کمہلاتا جا رہا ہے۔ کیا تم اس بیمار سیارے کی تیمارداری کرنا پسند کرو گے۔

اگرچہ اس سیارے کی تباہی سے نظام شمسی کی حرکت اور کہکشاؤں کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا مگر تمہارے تحت الشعور میں کندہ مرکزِ کائنات کے اس نظریے کی دھجیاں بہرحال اڑ جائیں گی جو زمانہ جاہلیت میں بھی سب سے بڑا نظریہ تھا اور اکیسویں صدی میں بھی سب سے بڑا ارمان ہے۔ سمندر کا سانس گھٹ رہا ہے۔ جب تیل کی تہہ لہروں پر ٹوٹ کر دھنک پیدا کرتی ہے تو مچھلیوں کی آنکھیں خیرہ ہوتی ہیں۔ شاید اسی لیے ان کی نظر کمزور ہو چکی ہے اور وہ تیرتے ہوئے ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔ پرانے دور میں جب سمندر میں گہرا

غوطہ لگایا جاتا تو آبی پہاڑ وادیاں اور سبزہ دور سے یوں نظر آتا تھا جیسے کسی پہاڑی علاقے میں کوئی پیراشوٹ سے جست لگا کر ہوا میں تیرے تو پہاڑی منظر نظر آتا ہے۔ جیسے فضا میں تیرتے ہوئے ہوا باز کو پرندے نظر آتے ہیں یوں کسی دور میں غوطہ خور کو مچھلیاں اور آبی جانور دکھائی دیتے تھے۔ اب سمندر کا پانی اندھا ہو چکا ہے اور غوطہ خور نابینا۔ آبی پہاڑیوں میں دراڑیں پڑ رہی ہیں۔ تودے گر رہے ہیں۔ آبی لینڈ سلا ہیڈنگ سے سمندری شاہراہیں بند پڑی ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ دھڑا دھڑ ماہی گیری سے آبی نظام تباہ ہو رہا ہے۔ سمندر کا اپنا نظام ہے، اپنا توازن ہے اور اپنا ماحول۔ بڑی مچھلی چھوٹی کو کھاتی ہے، چھوٹی آبی پودوں کو اور آبی پودے زمین کی نمکیات کو۔ انسان اس توازن کو بگاڑ رہا ہے۔ نتیجتاً سمندر اندھا ہو چکا ہے۔

زمین شاید لکڑی کی بنی ہوئی ہے اور انسانوں کا اژدہام اسے دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ زمین کھوکھلی ہو رہی ہے۔ زمین کا اپنا نظام ہے، اپنا توازن ہے اور اپنا ماحول۔ بڑا جانور چھوٹے کو کھاتا ہے اور چھوٹا کیڑوں مکوڑوں کو۔ انسان نے چونکہ زندگی کو بہت سنجیدگی سے لیا ہے اور موت کا خوف سرسام کی طرح دماغ کو چڑھ گیا ہے اسی لیے انسان نے اپنے آپ کو جانوروں کی صف سے علیحدہ سمجھ رکھا ہے۔ یہ فطرت کے قانون کی خلاف ورزی ہے مگر قدرت نے توازن کا نظام بہر حال قائم رکھا ہے۔ اب انسان جانوروں کی طرح اپنے ہم جنسوں کو مارتا ہے۔ انسان کو بہر حال مرنا ہے اگر جانور نہیں ماریں گے تو بارود مارے گا اور اگر بارود نہیں مارے گا تو زمینی اور آسمانی آفات ماریں گی، اگر پھر بھی انسانی آبادی قابو میں نہ آئی تو ایسی جینیاتی تبدیلی یا وبا پیدا ہو سکتی ہے جو نسل کا خاتمہ کر دے گی۔ ڈائنوسار بھی تو آخر ختم ہوئے تھے۔ وہ بڑے جانور تھے۔ انسان چھوٹا جانور ہے۔۔۔ تم آٹھوں چھوٹے جانور ہو۔۔۔ میری طرح۔''

زینو نے دائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے ہوا میں ایک قوس بنائی جو آٹھ

چہروں کو قطع کرتی تھی اور پھر ہاتھ اپنے سینے پر رکھ دیا۔ اس نے اپنا بیگ کھولا۔ گلاس اور بوتل میز پر رکھی۔ سرخ وائن گلاس میں انڈیل کر جام ہوا میں بلند کیا۔

''چیئرز۔''

''چیئرز'' آٹھوں نے جام اٹھائے۔

''ایک بار میں نے دارا سے پوچھا کہ حکومت کرنے سے کیا ہوتا ہے۔۔۔کیا ملتا ہے؟'' تو جواب میں اس نے شاہانہ مسکراہٹ کی قوس چہرے پر پھیلا کر کہا کہ چہرہ اس طرح مسکراتا ہے۔۔۔سکندر کے چہرے پر بھی شاہی مسکان کی قوس پھیلی رہتی تھی۔ میں نے ایک بار سکندر سے کہا کہ دنیا بہت وسیع ہے۔۔۔کوئی بھی شخص ساری دنیا پر حکمرانی نہیں کرسکتا ۔۔۔حکمرانی کا مزا ہی تب ہے جب قلمرو ساری دنیا ہو۔۔۔ساری دنیا۔'' زینو نے ہوا میں دائرہ بنایا۔

''آج کل ساری دنیا میں کون حکمران ہے؟ کوئی ہے کہ جو چہرے پر مسکراہٹ کی قوس بنا کر کہہ سکے کہ ہاں۔۔۔میں ہوں! آج کل اگر دنیا پر حکومت ہے تو بس جنون کی۔ دنیا پر بین الاقوامی مالیاتی اداروں، ملٹی نیشنل کمپنیوں اور سراغ رساں ایجنسیوں کی حکومت ہے۔ اس دنیا پر کسی ایک شخص کی تو کیا، کسی بھی شخص کی حکومت نہیں ہے۔ دنیا پر جنون حکومت کرتا ہے۔ جنون کمزور ہو جائے تو ہیجان بغاوت کر کے عنانِ اقتدار سنبھالتا ہے۔'' زینو نے گھونٹ بھرا اور سپاٹ چہروں پر نظر ڈالی۔

''میرے پاس اتنی دولت ہے کہ اس کے حساب کے لیے ہندسے ایجاد نہیں ہوئے۔ یہ ساری دولت سمندروں میں دفن ہے۔ بحیرۂ آژ میں ایک جزیرہ ہے جو کبھی روئے زمین پر تھا۔ مگر اب چالیس فٹ پانی کے نیچے ہے۔ میں وہ جزیرہ اب بھی زمین پر نمودار کرسکتا ہوں۔ اس جزیرے میں اب بھی بہت سونا ہے۔ اس کی ایک چٹان میں ہیروں کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے جتنا بڑا یہ تھیئٹر۔۔۔زمین پر اس جزیرے جیسے اور بھی کئی مقامات ہیں۔۔۔

میں ساری دنیا خریدنا چاہتا ہوں۔۔۔ساری دنیا! بولو مجھے کون بیچتا ہے؟ میں ساری دنیا خرید کر تمام سرحدیں توڑ دینا چاہتا ہوں۔کرنسی اور بینکوں کا کاروبار ختم کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ بولو کون بیچتا ہے؟'' زینو نے پیشکش کی۔

''آپ انہونی بات کرتے ہیں۔''امریکی صدر نے دھیمی اور سنبھلی ہوئی آواز میں کہا۔

''اس میں انہونی بات کیا ہے! آج کے دور میں ہر چیز کی قیمت ہے۔تمہارے ملک کی قومی آمدن، معاشی اصولوں پر متعین ہوتی ہے جو میں ادا کرنے کے لیے تیار ہو۔تم اپنا ملک مجھے بیچو۔میں خریدتا ہوں۔یہاں تک کہ تمہارے تمام ملکی اور غیر ملکی قرضے بھی اس قیمت میں شامل ہوں گے۔''

''آپ آخر ہمارا ہی ملک کیوں خریدنا چاہتے ہیں؟امریکی صدر نے پوچھا۔

''فرض کیا کہ میں ایک کار خریدنا چاہتا ہوں؟'' زینو نے جواباً پوچھا۔

''مگر۔۔۔کار اور ریاست میں فرق ہے۔۔۔آخر کار'' صدر نے رائے دی۔

''کیا فرق ہے؟ دونوں کی مشینری ہے۔دونوں چلتی ہیں۔دونوں کا چلانے والا ہوتا ہے۔ دونوں خراب ہوجاتی ہیں۔دونوں ٹھیک بھی ہوجاتی ہیں۔دونوں کی قیمت ہے۔۔۔

کیونکہ آج کے دور میں ہر چیز کی قیمت ہے۔'' زینو نے دوسرا گلاس بھرا۔

آپ دنیا کو سونے اور ہیروں کے بدلے خریدنا چاہتے ہیں اگر ہم سونے اور ہیرے کو کرنسی ماننے سے انکار کردیں تو آپ کیا کریں گے؟ کئی ٹن سونا اب بھی بینکوں میں پڑا ہوا ہے مگر وہ کرنسی نہیں ہے۔ چنانچہ زرِمبادلہ کی حیثیت سے سونے کی کوئی اہمیت نہیں۔'' امریکی صدر نے سوال کیا۔

سونے اور ہیرے کی میرے نزدیک بھی کوئی اہمیت نہیں۔تم اگر سونے اور

ہیرے کی اہمیت جاننا چاہتے ہو تو دنیا بھر کی عورتوں سے پوچھو۔سونا اور ہیرا ان کے دلوں کا ارمان ہے۔مردوں کی اکثریت بھی اس کی اہمیت کی معترف ہے۔اگر ایک میدان میں بہت سا سونا اور ہیرے رکھ دیئے جائیں اور دوسری طرف کاغذی کرنسی کے انبار۔۔تو لوگ کس طرف دوڑیں گے؟'' زینو نے کہا۔

''آپ عجیب وغریب مگر دلچسپ باتیں کرتے ہیں چلیے آپ تو ساری دنیا کے خریدار ٹھہرے۔مگر بیچنے والا کون ہوگا؟'' برطانوی وزیراعظم نے پوچھا۔

''آپ لوگ!'' زینو نے آٹھوں کی طرف اشارہ کیا۔

''مگر ہم ایسا اہم فیصلہ نہیں لے سکتے۔ہمیں اپنی کانگریس یا پارلیمنٹ سے پوچھنا ہوگا۔شاید ریفرنڈم بھی کروانا پڑے گا یا گلیپ پول۔۔۔'' امریکی صدر نے کہا۔

''اگر تم لوگ فیصلہ نہیں کر سکتے تو میٹنگ کیوں کر رہے ہو؟'' زینو نے پوچھا۔

''دیکھئے صاحب بادشاہت اور جمہوریت میں فرق ہے۔''

''کیا فرق ہے؟'' زینو نے پوچھا۔

''بادشاہت میں ایک شخص فیصلہ کرتا ہے جبکہ جمہوریت میں پورا ملک۔''

امریکی صدر نے کہا۔

''پورا ملک کبھی بھی فیصلہ نہیں کرتا۔خواہ وہ بادشاہت ہو یا جمہوریت۔ایک مختصر سا گروہ ہوتا ہے جو فیصلے بناتا ہے۔اگر بادشاہت ہو تو یہ فیصلے بادشاہ سناتا ہے اور اگر جمہوریت ہو تو صدر یا وزیراعظم۔۔۔فیصلے کرنے اور سنانے میں فرق ہوتا ہے۔۔۔لوگ صرف فیصلے سنتے ہیں۔'' زینو نے کہا۔

''چلئے ہم اپنے گروہ سے پوچھیں گے۔'' برطانوی وزیراعظم نے کہا۔

''پوچھ لو۔''

''کیا آپ ہمارا ملک شہروں سمیت خریدیں گے؟'' امریکی صدر نے اچانک

حیرت سے پوچھا۔

''کیا کار بیچنے والا مجھے ایسا سوال کرے گا؟۔۔۔ظاہر ہے کہ کار انجن اور پہیوں سمیت خریدی جاتی ہے۔بے کار، کار، کار نہیں ہوتی۔۔۔کار، کار، ہوتی ہے۔آخر کار۔'' زینو نے سمجھایا۔

''فرض کیا میں ایک بہت بڑی اور پرانی حویلی خریدنا چاہتا ہوں جس میں کئی خاندان نسل در نسل آباد ہیں۔ظاہر ہے کہ ان خاندانوں کو وہ حویلی خالی کرنا پڑی گی اور اگر میں حویلی خریدنے کے بعد انھیں یہ کہوں کے وہ اس میں رہ سکتے ہیں تو وہ بخوشی رہیں گے۔'' زینو نے پھر سمجھایا۔

''یعنی اس جدید، ترقی یافتہ اور مہذب دور میں ہم آپ سے انسانوں کا سودا کریں گے؟ کیا آپ ہم سے یہ توقع کرتے ہیں؟''اس بار صدر نے جذباتی لہجے اور اونچی آواز میں ردعمل کیا۔

''سمندر اندھا اور زمین کور چشم۔۔۔اور تم اسے جدید، ترقی یافتہ اور مہذب دور کہتے ہو؟'' زینو نے پوچھا۔

''آپ ترقی یافتہ دور کسے کہتے ہیں؟'' برطانوی وزیر اعظم نے گلا صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''ترقی یافتہ اور غیر یافتہ مبہم تراکیب ہیں۔کسی بھی دور میں نظامِ قدرت قائم رہنا چاہیے۔نظام قدرت توازن اور اعتدال میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتا۔جب سے تہذیب قائم ہوئی ہے، کوئی بھی دور ترقی یافتہ نہیں رہا۔وسائل کا حصول اور استعمال ہمیشہ سے انسان کا نصب العین رہا ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وسائل کے حصول کا جذبہ پختہ ہوتا رہا۔آج کل یہ جذبہ ایک جنون کی شکل اختیار کر گیا۔اسی لیے دنیا پر کسی شخص کی حکومت نہیں۔۔۔دنیا پر جنون حکومت کرتا ہے'' زینو بولا۔

''تو کیا انسان دوبارہ غار کے دور میں چلا جائے؟'' برطانوی وزیراعظم نے پوچھا۔

''غاریں تو سامنے نظر آ رہی ہیں۔'' زینو نے تھیئٹر کے اندھیرے ہال میں پڑی ہوئی خالی نشستوں کی طرف اشارہ کیا۔

''معاف کیجیے۔آپ کے خیالات خاصے دقیانوسی ہیں۔'' امریکی صدر نے گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں نے دنیا خریدنے کا جدید خیال پیش کیا تھا مگر تم اس کی حامی بھی نہیں بھرتے۔'' زینو نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر گلاس ہوا میں بلند کر کے خرید و فروخت کا جام تجویز کیا۔

''میں ساری دنیا خریدتا ہوں۔۔۔بولو کون بیچتا ہے؟ ساری فری مارکیٹ سے میرا سوال ہے، سارے کمیونسٹوں سے، سارے سوشلسٹوں سے اور ساری بادشاہتوں سے!''

''ہم نے عرض کیا نا کہ ہم اپنے گروہ سے پوچھیں گے۔'' برطانوی وزیراعظم نے دہرایا۔

''تو پوچھو۔'' زینو نے زور دے کر کہا اور ٹیلیفون کی طرف اشارہ کیا۔آٹھوں سربراہوں نے موبائل فون چلائے اور ایسے گفتگو کرنے لگے جیسے سٹاک ایکسچینج کے کارندے مارکیٹ کے بھاؤ اترنے اور چڑھنے پر جذباتی انداز میں لگاتار بولتے ہیں یوں کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔آدھا گھنٹہ شور غل برپا رہا۔جام بھرتے چھلکتے رہے۔وائن کی میٹھی اور کسیلی مہک بخارات کی صورت میں ہر موبائل فون کے مساموں میں اترتی رہی۔وہ اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے اور ہیجان انگیز لہجے میں بات چیت کر رہے تھے۔تھیئٹر کا سٹیج بھاری قدموں کی چاپ سے تھرتھرا رہا تھا۔بالآخر ایسا سناٹا طاری ہوا جیسے سٹاک ایکسچینج کا

کاروبار بند ہونے ہوا کرتا ہے۔ سارے نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور خاموش تھے۔

''تو کیا طے پایا؟'' زینو نے پوچھا۔

''ہمیں کہا گیا ہے کہ صرف میٹنگ کے ایجنڈے پر بات چیت کریں۔'' سب نے متفقہ فیصلہ سنایا۔

''میٹنگ کا ایجنڈا کیا ہے؟''

''دنیا کی فلاح و بہود، غربت کا خاتمہ، دہشت گردی کا خاتمہ، غریب ملکوں کے قرضوں کا معاملہ، ماحولیاتی آلودگی، جینیاتی تبدیل شدہ بیجوں سے کاشت کاری اور خلانوردی۔''

''تم دنیا کی فلاح و بہود کرو۔ میں چلتا ہوں اور ہاں برٹل کو پریشان کرنا چھوڑو۔ اس کا قصور صرف یہ ہے کہ اس نے مجھے دریافت کیا۔ اب بین الاقوامی مالیاتی ادارے برٹل کو رات دن زچ کرتے ہیں۔ سونے اور ہیروں کا پتہ پوچھتے ہیں۔ ان اداروں کو یہ فکر لاحق ہے کہ بے پناہ دولت اگر اچانک سطح زمین پر آ گئی تو بین الاقوامی معیشت کا کیا بنے گا۔ اس بات کا فیصلہ میں کروں گا کہ دولت کب نمودار ہوئی اور اس کا عالمی معیشت پر کیا اثر ہوگا!''

زینو نے اپنا بیگ بند کیا۔ سٹیج سے اترا اور کرسیوں کے درمیان چلتا ہوا اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

بابِ ہشتم

ٹیکسلا میں رات تھی۔ رات میں خنکی تھی۔ خنکی میں خاموشی تھی اور خاموشی بولتی تھی۔ تحسین کے گھر کے باہر کھنڈر تھے جن کی تاریکی میں مہاتما بدھ کے قدیم مجسمے تھے۔ گھر کے اندر سٹوڈیو تھا جس کی مدھم روشنیوں میں مہاتما بدھ کے نقش ثانی تھے۔ یہ جدید مجسمے تھے۔

سب لوگ تحسین کے بیڈروم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آتش دان میں توت کی لکڑیاں جل رہی تھیں۔ ایک صوفے پر برٹل اور رایوا تھے اور دوسرے پر زینو اور ایما۔ تحسین آتش دان میں لکڑیوں کو آڑا ترچھا رکھ رہا تھا۔ ٹی وی پر خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ خبروں کے دوران نیوز کاسٹر لڑکی نے ایک نئی بات سنائی۔

''جغرافیہ دانوں نے خبر دی ہے کہ بحیرہ آڑ میں اچانک ایک جزیرہ نمودار ہو گیا ہے جو پہلے وہاں موجود نہیں تھا۔ یہ جزیرہ اپنی نوعیت کا ایک انوکھا شاہکار ہے کیونکہ اس کے

گرد سمندر کا پانی باقی سطح آب سے بہت نیچے ہے اور بڑی تیزی سے جزیرے کے گرد گھومتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سمندر کے راستے اس جزیرے تک پہنچنے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ جزیرے کے گرد دس کلومیٹر کے دائرے میں کشش ثقل انتہائی شدید ہے۔ کوئی ہوائی جہاز اگر اس دائرے میں داخل ہو جائے تو توازن کھو دیتا ہے۔ اب تک دس ہوائی جہاز اور چار بحری بیڑے اس آبی دائرے میں تباہ ہو چکے ہیں۔ سائنس دانوں نے خلا اس جزیرے کی تصویریں بھیجی ہیں۔ یہ جزیرہ سائنس دانوں کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے جو رات دن اس کی پراسراریت کا کھوج لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

برٹل نے کہا ''نیا سال شروع ہونے میں بیس دن ہیں۔ کیوں نہ اس بار نیو ائیر نائٹ اس جزیرے پر منائی جائے!''

''جزیرہ ابھی گیلا ہے۔ تازہ تازہ سمندر سے نکلا ہے۔ کیا بیس دنوں میں نیو ائیر نائٹ منانے کے قابل ہو جائیگا؟'' تحسین نے پوچھا تو زینو مسکرایا۔ زینو کچھ دنوں سے چپ چپ تھا۔

کھانا کھانے کے بعد زینو اکیلا ٹہلتا ہوا گھر سے باہر نکلا۔ کھنڈروں کے اوپر دسمبر کا پورا چاند چمک رہا تھا۔ اسے یاد آیا جب وہ پہلی بار ٹیکسلا آیا تو موسمِ بہار تھا۔ پورا چاند جب پہاڑی کی اوٹ سے نکلا تو اس نے ایما کے ساتھ چاند کو تیزی سے بلند ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس رات پہاڑیاں سیاہ ہو چکی تھیں مگر پھول اپنے رنگ بتاتے تھے۔ دور اک سیاہ دھبہ لرزنا شروع ہوا تھا جو ترقی کرتے کرتے ایک انسانی پیکر بن گیا تھا۔ قریب آ کر وہ شخص انہماک سے دونوں کو دیکھتا رہا تھا اور پھر سنسکرت میں بولا تھا:

''ٹیکسلا کی رات کو جب چاند ہوتا ہے تو سورج کم کم یاد آتا ہے۔''

اس شخص کا نام کوتلیہ چانکیہ تھا۔ وہ ان دنوں ایک کتاب لکھ رہا تھا، جس کا نام ارتھ شاستر تھا۔

کچھ دیر ٹہلنے کے بعد زینو واپس گھر میں داخل ہوا۔ ادھر ادھر پھرتا رہا پھر تحسین کے سٹوڈیو میں داخل ہوا۔ نیم روشن تاریکی اور نیم تاریک روشنی میں مہاتما بدھ کے نہایت دلکش مجسمے نروان میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پتھر کی نگاریں سل پر فاسٹنگ بدھا بیٹھا ہوا تھا۔ آغوش میں ڈھلکی ہوئی چادر کا جھول تھا۔ بازوؤں کے پٹھوں پر وریدوں کی شاخیں تھیں۔ کاسئہ سر عموداً ٹھہرا ہوا تھا مگر چہرہ زاویے پر تھا۔ یوں کہ خالی کاسئہ چشم کی کھوکھلاہٹ کا رخ بائیں جانب تھا۔ زینو نے مسکرا کر سدھارت کو دیکھا۔

رات کے دو بج رہے تھے۔ ایوا اور ایما سو گئی تھیں۔

''تحسین! جس طرح تم سے پہلے سے بنے ہوئے شاہکار مجسموں کو دوبارہ بناتے ہو ویسے ہی پہلے سے بنے ہوئے انسان کو دوبارہ بنانا پڑے گا۔'' زینو نے کہا تو تحسین سوچ میں پڑ گیا۔ برٹل بھی متوجہ ہوا مگر خاموش رہا۔ زینو، برٹل اور تحسین تینوں ایک سطح پر سوچتے تھے۔ ایک بات کرتا تو دوسرا سمجھ جاتا، دوسرا بات کرتا تو تیسرا۔

''بنے ہوئے انسان کو دوبارہ بنانا پڑے گا۔ میں نے انسان کے دماغ میں وہ مرکز دریافت کر لیا ہے جو انسان کو مستقبل کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ میں نے وہ کیمیاوی سفوف بھی بنا لیا ہے جس کے اثر سے انسان کا یہ مرکزِ فردا یا فیوچر سنٹر کام کرنا چھوڑ دے گا۔ میں نے یہ بھی تحقیق کر لیا ہے کہ اگر ذرا سا سفوف ہوا میں اڑایا جائے تو خود بخود افزائش کرے گا اور آکسیجن کے تمام مالیکیولوں کے ساتھ جڑ جائے گا۔ سانس کے ذریعے اس کا اثر انسانی دماغ تک پہنچے گا اور کام کرے گا۔ جوں جوں مادی ترقی ہوتی گئی انسانی دماغ میں مستقبل پسندی کا رجحان جگہ بناتا گیا اور اب یہ عالم ہے کہ انسان اپنے حال سے بے خبر ہے۔ انسانی دماغ میں فیوچر سنٹر سب سے مضبوط حصہ ہے اور انسان کی تمام ذہنی اور جسمانی توانائیوں پر حکومت کرتا ہے۔۔۔ بنے ہوئے انسان کو دوبارہ بنانا پڑے گا۔۔۔''

زینو بولا۔

صبح زینو گھر سے نکلا۔اس کے ہاتھ میں بیگ تھا۔اس نے سفوف کی شیشی نکالی جس کے منہ پر مضبوطی سے بند کیا ہوا ڈھکنا تھا۔کچھ فاصلے پر ایک بڑا پتھر تھا جس پر سرما کی صبح کی نمی تھی۔زینو نے شیشی پتھر پر دے ماری۔دھوئیں کا ایک بادل نمودار ہوا جس میں زینو کچھ دیر کے لیے غائب ہو گیا۔کچھ دیر بعد غبار چھٹا۔زینو نے تیر کمان نکالا۔تیر کمان میں بھرا۔ چڑھتے ہوئے سورج کا نشانہ لیا۔تیر کی دم کے گرد سونے کا پترا تھا۔اس کی نوک بھی سونے کی تھی۔کمان نے تشنج بھری انگڑائی لی۔سنسناہٹ کے ساتھ تیر ہوا میں نکلا۔سر بریدہ سٹوپا کے اوپر سے اڑتا ہوا۔۔۔مہا تما بدھ کے مجسمے کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا،جس کے پاؤں میں سات زمینیں اور سر پر سات آسمان ہیں،کھنڈروں کے اوپر تیر ہوا میں غائب ہو گیا۔

زینو نے قریبی درخت کو دیکھا۔کوئی پرندہ تیر کے تعاقب میں نہیں نکلا تھا۔